Regd.L.No.7243 Phone ۸۸۰۸۰۰

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1981

اس پرچہ میں :-

اسلامی مملکت کا تصور

(علامہ اقبال رہ کے نزدیک)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک ۸۰/- روپے (رجسٹرڈ بحری ڈاک)	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۴	مئی ۱۹۸۱ء	شمارہ ۵

فہرست

۱۔ لمعات ---- (اسلام اور سیاسی پارٹیاں) ---- ۲
۲۔ قرآن کا مقام ---- ۲۲
۳۔ ماہرینِ قانون حضرات توجہ فرمائیں ---- ۲۳
۴۔ اسلامی مملکت کا تصوّر۔ اقبالؒ کے نزدیک ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۲۵
۵۔ مجلس قلندرانِ اقبالؒ ---- (محترم خورشید عالم) ---- ۴۱
۶۔ رجم کی سزا ---- ۴۹
۷۔ حقائق و خبر ---- ۵۳
۸۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ---- ۵۴
۹۔ اعلاناتِ قرآنی درس ---- ۵۶
۱۰۔ تحریکِ پاکستان کی کہانی - طلوعِ اسلام کی زبانی ---- (قسط دوم) ---- ۵۷

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر۔ سراج الحق۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

(اسلام اور سیاسی پارٹیاں)

قارئینِ طلوع اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے وحدتِ اُمّت کے حق میں اور فرقہ بندی، اور تفرقہ انگیزی کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا جامع اور استدلال ہے کہ اس کے بعد اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ امت میں ہر قسم کا اختلاف اور افتراق خلافِ اسلام ہے۔ دین (اسلامی نظام) اور وحدتِ اُمّت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، مروّجہ اسلام یا سیکولرازم کے حامی مسلمان اس حقیقت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہاں ایک صاحب فرماتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی اجازت نہیں۔ خود صحابہ رضؓ میں سیاسی پارٹیاں موجود تھیں۔ مہاجرین اور انصار دو سیاسی پارٹیاں تھیں جنہوں نے اسی حیثیت سے، سقیفہ بنی سعد میں، پہلا انتخاب لڑا تھا۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ صدیق کا انتخاب۔ اس کے متعلق وضاحت مطلوب ہے۔

طلوعِ اسلام

ہم بھی عجیب "قسمت" لے کر آئے ہیں! ایسا نظر آتا ہے گویا (عوام کے الفاظ میں) ہمارے مقدر میں یہ لکھا ہے کہ ہم عمر بھر اسلام کے مسلّمات اور بدیہیات کی مدافعت کرتے رہیں، اور دین کے ان اساسی اصولوں کے خلاف (جن کے واجب التسلیم ہونے میں کسی مسلمان کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے) خود مسلمانوں کی طرف سے اعتراضات کا جواب دیتے رہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہمارا سارا وقت اس بنیادی حقیقت کو "ثابت کرنے" میں صرف ہو گیا کہ دین کا تمکن صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآن کریم کے احکام و اقدار، قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ ہو سکیں۔ حصولِ پاکستان کے بعد اس بحث کا خاتمہ ہوا تو اس قسم کے سوالات ابھرنے شروع ہو گئے کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں۔ کسی مملکت کے آئین و قوانین کو اسلامی کس صورت میں کہا جا سکتا ہے؟ اسلامی حکومت اور سیکولر نظام میں فرق کیا ہے؟ ہمارے وقت اور توانائی کا بیشتر حصہ اسی قسم کے سوالات کے جواب دینے اور دین کے مسلّمات کو (گویا) ثابت کرنے میں صرف ہو گیا (اور ہو رہا ہے)۔ اعتراضات تو ہر قسم کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور ہم ان کے خوگر بھی ہو چکے ہیں، لیکن یہ اعتراض (جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے) نہ صرف

یہ کہ ہم نے پہلی بار سنا ہے بلکہ (جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے) ہماری تاریخ میں پہلی بار ایسا کہا گیا ہے کہ مہاجرین اور انصار دو سیاسی پارٹیاں تھیں! اس پر ہم اس سے زیادہ کیا عرض کریں کہ ایسا کہنے والے نہ صرف یہ کہ اسلام کی بنیادی تعلیم سے ناواقف ہیں، بلکہ انہوں نے صحابہ کبارؓ پر ایسا سنگین الزام لگایا اور ایسا روح فرسا بہتان تراشا ہے جس سے ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ پھر اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) اقامتِ دین کے مدعیوں نے یہ طرح ڈال دی ہے کہ جہاں کسی نے ان کی کسی مذموم حرکت پر مؤاخذہ کیا، انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے۔

ہم اس موضوع پر گذشتہ تیس سال سے لکھتے چلے آرہے ہیں اور اس کی بیّن مثالیں بھی دیتے رہے ہیں۔ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہ قارئینِ طلوعِ اسلام کے ذہن میں ہوگا۔ سردست بات سیاسی پارٹیوں کی .... ہو رہی ہے۔ جب ان کے وجود کو غیر اسلامی کہا گیا تو جواب میں کہہ دیا کہ سیاسی پارٹیاں خود صحابہؓ میں موجود تھیں۔ انصار اور مہاجرین دو سیاسی پارٹیاں ہی تو تھیں! ایسے ہی تھے وہ حضرات جن کے متعلق اقبالؒ نے انتہائی سوز و گداز کے عالم میں کہا تھا کہ ؎

چگونم مسلمانِ نامسلمانے کہ گرچہ پورِ خلیلؑ است، آزری داند

اور ہماری بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں اس قسم کے اعتراضات کا بھی جواب دینا پڑتا ہے!

کسے معلوم تھا، عشق اس طرح لاچار کرتا ہے!

(٠)

نوعِ انسان مختلف وجوہات و علل کی بنا پر، مختلف گروہوں میں بٹتی چلی آرہی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان تمام وجوہِ تفرق و اسبابِ تقسیم کو بالاستطاق رکھ کر، تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ط..... (۶۴/۲)

اللہ نے تم تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے، کچھ مومن۔

وہ کونسی صداقت تھی جس کے ماننے والے (مومن) ایک گروہ قرار پا گئے۔ اور اسے نہ ماننے والے (کافر) دوسرا گروہ؟ یہ ضابطۂ خداوندی تھا جسے الکتاب یا قرآن مجید کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا ضابطہ ماننے والے، ایک گروہ۔ ایک جماعت۔ ایک اُمت۔ ایک "پارٹی"۔ اور ایسا نہ ماننے والے، ان کے بالمقابل، دوسرا گروہ۔ دوسری اُمت۔ دوسری پارٹی۔ انہی دو گروہوں کو اس نے حزب اللہ ——— اللہ کی پارٹی (۵/۵۶) اور حزب الشیطان ——— شیطان کی پارٹی (۵۸/۱۹) کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا، اسلام کی رو سے دنیا میں پارٹیاں دو ہی ہیں ——— حزب اللہ اور حزب الشیطان۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حزب اللہ کی وجۂ جامعیت، ضابطۂ خداوندی (قرآنِ مجید) کے ساتھ تمسک اور اعتصام تھا۔ یعنی دنیا کے مختلف افراد، جنہوں نے کتاب اللہ کو ضابطۂ حیات تسلیم کر لیا، حزب اللہ کے ارکان بن گئے۔ اس لئے ان سے تاکیداً کہا کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ..... (۳/۱۰۳)

(اے افرادِ حزب اللہ) تم سب کے سب، اللہ کی کتاب کے ساتھ وابستہ رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔

یعنی ارکانِ حزب اللہ (افرادِ جماعتِ مومنین۔ امّتِ مسلمہ) میں سے جس نے ضابطۂ خداوندی کے سوا کسی اور ضابطہ کے ساتھ تمسک (ہیوستگی) کرلی وہ اس حزب کا رکن اور اس جماعت کا فرد نہ رہا۔ تفرقہ کے معنی ہی اصل سے الگ ہوجانا ہے۔ اس لئے "اعتصام بحبل اللہ" کے ساتھ، تفرقہ سے اجتناب کی بھی تاکید کردی، کیونکہ یہ دونوں یکجا نہیں رہ سکتے۔ اعتصام بحبل اللہ ہوگا تو اس کا نتیجہ امّتِ واحدہ ہوگی۔ اعتصام بحبل اللہ نہ رہے گا تو وحدت ٹوٹ جائے گی اور تفرقہ پیدا ہوجائے گا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اعتصام بحبل اللہ کو توحید اور تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ فرمایا:

..... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، کہیں تم (توحید کے قائل ہونے کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہوجانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرلیا اور اس طرح ایک الگ پارٹی بنالی۔ اس پارٹی بازی میں کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر (اور دوسری پارٹیوں کو باطل پر) سمجھتا ہے۔

رسول اللہ، حزب اللہ (امّتِ مسلمہ) کی مملکت کے سربراہ تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس حزب سے الگ کوئی پارٹی بنا لیں، ان کے سربراہ (HEAD) رسول اللہ نہیں رہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

اے رسول! جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرکے الگ پارٹی بنالیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہیگا۔

ان آیات میں، دین میں تفرقہ پیدا کرکے ایک الگ پارٹی (شیعًا یا حزب) بن جانے کو شرک اور رسول اللہ سے لاتعلقی (کفر) قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں (یعنی قرآن کی رو سے) مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ دین ان دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔ مذہب اور سیاست کا الگ الگ تصور اور الگ الگ اصطلاحات، سیکولرازم کی پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا، جب قرآنِ کریم نے دین میں تفرقہ کو شرک اور انکارِ رسالت قرار دیا تو اس میں مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی تحزّب (پارٹی بازی) دونوں آگئے۔ ذرا غور کیجئے کہ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں وجود میں کس طرح آتی ہیں؟ مذہبی فرقے عقائد میں اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں، اور سیاسی پارٹیوں کا منشور الگ الگ ہوتا ہے۔ اگر صرف خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک ہو تو نہ عقائد مختلف ہوسکتے ہیں، نہ منشور الگ الگ۔ اور جب عقائد اور منشور الگ الگ نہیں ہوں گے تو نہ مذہبی فرقے باقی رہیں گے، نہ سیاسی پارٹیاں۔ ایک ضابطۂ حیات اور اس کی ماننے والی ایک امّت باقی رہے گی۔ یہی اسلام کی بنیادی شکل ہے۔

امت کی یہی وحدت تھی جس سے وہ دین و دنیا کی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی مستحق قرار پائی تھی۔ اس کے برعکس، اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے عذاب قرار دیا تھا اور اس سے جماعتِ مومنین کو بڑی سختی سے روکا تھا جب فرمایا تھا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۳/۱۰۴)

اے جماعتِ مومنین! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایات آجانے کے بعد، تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا اور اس طرح عذابِ عظیم کے مستوجب ہو گئے۔

اس عذاب کو قرآن نے "منہ کالا ہو جانے" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی دنیا اور آخرت کی روسیاہی (۳/۱۰۵)

یہ تو دین اور امتِ مسلمہ کا معاملہ ہے۔ کسی (عام) قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دینا بھی بارگہِ انسانیت میں ایسا سنگین جرم ہے جس کی قرآنِ کریم نے شدید مذمت کی ہے۔ اس نے سیاستِ فرعونی کے خلاف جو فردِ جرم عائد کی تھی اس میں سرِفہرست یہ لکھا تھا کہ

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ ...... إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۸/۴)

حقیقت یہ ہے کہ فرعون انتہائی سرکشی پر اتر آیا تھا۔ وہ ملک کے باشندوں (قوم) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور پھر اپنی ابلیسی سیاست کی رو سے کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا کبھی دوسری کو۔ ...... یوں وہ فسادِ عظیم برپا کرتا رہتا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے، قوم میں پارٹیاں بنانا 'سیاستِ فرعونی' ہے۔ سو جب وہ اسے فرعون کی قوم میں بھی جائز نہیں سمجھتا تو اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نظام (اسلام) میں اسے جائز قرار دے گا؟ وہ اسے خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ، سورۃ الانعام میں، عذابِ خداوندی (قوموں کی تباہی) کی مختلف شکلوں کے سلسلہ میں ایک شکل یہ بتاتا ہے، أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ... (۶/۶۵) کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے اور اس طرح باہمی تصادم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے، عام قوموں میں بھی ..... پارٹی بازی کا نتیجہ۔ یہ خدا کا عذاب ہے۔

———— (٠) ————

ان تصریحات کی روشنی میں کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کبارؓ مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے؟ ان کے ایمان و تقویٰ کے علاوہ، قرآنِ کریم نے ان کی بنیادی صفات یہ بتائی ہیں کہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ان کے باہمی تعلقات نہایت محبت اور مودت کے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے، وہ باہمی عداوت سے گویا جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ...... (۳/۱۰۲) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا اور اپنی نعمتِ خصوصی کی رو سے انہیں

آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ وہ ایک جماعت تھی۔ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار (۶۱/۴) تھی۔ ہم پوچھتے ہیں ان بزرجمہروں سے جو فرماتے ہیں کہ صحابہ رضؓ سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، کہ کیا سیاسی پارٹیوں کے افراد کے باہمی تعلقات اسی قسم کے ہوتے ہیں؟ وہ تو ایک دوسرے کے جانی دشمن اور ہر وقت دوسری پارٹی کی تخریب اور تذلیل کی فکر میں رہتے ہیں۔

اب آیئے مہاجرین اور انصار کی طرف! سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی صورت یہ نہیں تھی کہ جماعت مومنین میں سے کچھ لوگوں نے اپنا الگ منشور مرتب کر کے، اپنی جداگانہ پارٹی بنالی تھی جسے وہ مہاجرین کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ اور ان کے مقابل، دوسری پارٹی نے اپنا الگ منشور اختیار کر کے دوسری پارٹی قائم کر لی تھی جو انصار کے نام سے موسوم تھی۔ بات یہ نہیں تھی۔ ہجرت اور انصاریت ان کی خصوصی صفات تھیں جن سے متصف ہونے کی بنا پر انہیں مہاجرین اور انصار کہہ کر پکارا گیا تھا۔ بعض افراد وہ تھے جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اور دوسرے وہ جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے ان آنے والوں کا دل کی کشادہ سے استقبال کیا اور ان کی ہر طرح سے امداد کی۔ قرآن کریم نے ان کی ان خصوصی اور متمیز صفات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ ..... (۸/۷۲)

وہ لوگ جنہوں نے اپنی جان اور مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور ہجرت کی۔ اور وہ جنہوں نے (ان لٹے پٹے کر آنے والوں کو) پناہ دی اور ہر طرح سے ان کی امداد کی۔
یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور پشت پناہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں، "بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" کہا ہے۔ نبی اکرمؐ نے عمل قدم اٹھایا اور ان میں سلسلۂ مؤاخات قائم کر دیا۔ یعنی مہاجرین میں سے ایک کو انصار میں سے ایک کا بھائی بنا دیا۔ اور اس مؤاخات میں انہوں نے 'من تو شدم تو من شدی' کا ایسا محیر العقول ثبوت دیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان تعلقاتِ اخوت میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ تقسیم وراثت تک میں انہیں حصہ دار سمجھنے لگ گئے۔ تاآنکہ اللہ تعالیٰ کو انہیں اس سے روکنا پڑا۔ کیونکہ اس سے رحمی رشتہ داروں کے مفاد متاثر ہوتے تھے۔ (۳۳/۶) قرآن کریم نے ان دونوں کو "مومن حقاً" (سچے اور پکے مومن) کی سند سے نوازا۔ (۸/۷۴) اور رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (۹/۱۰۰) کی شہادتوں سے سرفراز فرمایا اور انہیں جنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ ان کا یہ تعارفی تشخص (مہاجرین اور انصار) ابتدائے ہجرت سے وجود میں آگیا تھا اور حضور نبی اکرمؐ کی پوری مدنی زندگی میں یہ اسی طرح قائم رہا۔ کیا اس دوران میں کہیں آپ کو ان کے دو جداگانہ سیاسی پارٹیوں کے افراد ہونے کی خفیف سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے؟

معترضین کا کہنا یہ ہے کہ، رسول اللہؐ کی زندگی میں تو ایسا نہیں ہوا تھا لیکن رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے یکایک دو متخاصم سیاسی پارٹیوں کی شکل اختیار کر لی تھی اور حصولِ اقتدار کی خاطر، امت کا پہلا

انتخاب لڑا تھا! یعنی (بقول ان کے) رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد، ان میں ایسا انقلاب آیا کہ انہوں نے "رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ" — "بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ" — "اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ" — "فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا" کی خدائی سندات اور رسول اللہؐ کی قائم کردہ مؤاخات کا لبادہ یک دم اتار پھینکا اور دو حریف گروہوں کی شکل میں انتخاب لڑنے کے لئے ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو گئے! (عیاذاً باللہ).

ظاہر ہے کہ ان میں ایسی تبدیلی راتوں رات تو نہیں آ سکتی تھی۔ (بلکہ اس میں تو ایک رات بھی نہیں گذری تھی. انتخاب کا واقعہ تو حضورؐ کی وفات کے ساتھ ہی کا ہے) اس اعتراض سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یا وہ عمر بھر انہی خطوط پر دل ہی دل میں سوچتے رہے ہوں گے اور جونہی موقعہ ملا وہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ (استغفر اللہ!)۔

سوال یہ ہے کہ اس بات کی سند کیا ہے کہ مہاجرین اور انصار، اس "انتخابی مہم" میں متخالف سیاسی پارٹیوں کی طرح ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے؟ اس کی سند ہے ہماری تاریخ۔ اس تاریخ میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ انہوں نے آئینی انداز سے یہ انتخاب لڑا تھا۔ تاریخ اس سے آگے بھی بڑھتی ہے اور فریقین کے باہمی جدال کی ایسی تفصیلات پیش کرتی ہے جنہیں سینے پر پتھر رکھ کر بھی درج نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تاریخ کے اُردو تراجم بھی عام طور پر ملتے ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں بھی بہت سی تاریخی تفصیلات دی گئی ہیں۔

تاریخ کے علاوہ، ہماری کتبِ روایات میں بھی صحابہؓ کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے۔ مثلاً بخاری شریف کی اس روایت کو سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے چند صحابہؓ کو جہنم کی طرف لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ اس پر اللہ فرمائے گا کہ جب آپ ان سے الگ ہوئے تو یہ لوگ (مرتدین علیٰ اعقابھم) اسلام چھوڑ کر اپنے پچھلے دین کی طرف لوٹ گئے تھے۔
>
> (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب۔ کراچی۔ جلد دوم۔ صـ۱۴۹)

یہاں تو پھر بھی "چند صحابہؓ" کا ذکر ہے۔ ہماری تاریخ جملہ صحابہ کبارؓ کو جس مقام پر پہنچاتی ہے اس کے تصور سے (عام الفاظ میں) "عرشِ الٰہی تک ہل جاتا ہے"۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ

مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا ○ (۴/۹۳)۔

جو شخص کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا

۱؎ اشارہ (۳/۱۴۴) کی طرف ہے۔

کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ خدا نے اس کے لئے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایک مومن کے قتلِ عمد کی پاداش اور عقوبت کیا ہے؟ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد جنگِ جمل ہوئی تو اس میں (بجز معدودے چند) آدھے صحابہ رضؓ ایک طرف تھے اور آدھے دوسری طرف۔ ان میں باہمی جنگ ہوئی جس میں دس ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو قتل کر دے ——— دس ہزار صحابہ رضؓ کا قتلِ عمد خود ایک دوسرے کے ہاتھوں سے ——— اور اس کے بعد جنگِ صفین میں (تاریخ کے بیان کے مطابق) ستر ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے! آپ سوچئے کہ اگر اس تاریخ کو مستند مان لیا جائے تو پھر قرآن کریم کے مذکورہ صدر فیصلہ کی رُو سے) رسول اللہؐ کے ان تمام صحابہ رضؓ کے متعلق کیا نتیجہ اخذ کیا جائے گا؟

یہ ہے ہماری وہ تاریخ جس کی بنا پر، یہ کہا جاتا ہے کہ مہاجرین اور انصار دو مستقل سیاسی پارٹیاں تھیں۔ اور پھر صحابہؓ کی اس (مزعومہ) روش کو سند قرار دے کر یہ اصول مستنبط کیا جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہے!

حقیقت یہ ہے کہ امت ہزار سال سے جس خلفشار، انتشار، اختلاف اور افتراق کے عذاب میں مبتلا چلی آ رہی ہے اس کا بنیادی سبب ہماری تاریخ ہے (جس میں روایات بھی شامل ہیں) آپ کو معلوم ہے کہ یہ تاریخ مرتب کب اور کس طرح ہوئی تھی؟ ہمارے ہاں سب سے پہلی مفصل تاریخ (جسے نہایت مستند قرار دیا جاتا ہے) امام طبریؒ کی تاریخ ہے۔ (سب سے پہلی تاریخ بھی ان کی ہے اور سب سے پہلی تفسیر بھی انہی کی) یہ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے تیرہ جلدوں میں صدرِ اوّل کی تاریخ، بغیر کسی سابقہ ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر مرتب کی۔ اس کے علاوہ، انہوں نے تیس جلدوں میں قرآنِ مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ ان کی یہی تاریخ بعد میں مرتب ہونے والی تاریخوں کا ماخذ، اور ان کی تفسیر تمام تفاسیر کا سرچشمہ قرار پائی۔

مروجہ اسلام، اسی قسم کی تاریخ۔ تفسیر اور روایات پر مبنی ہے۔ (احادیث کے مجموعے بھی اسی طرح، زبانی روایات کی بنا پر، تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے تھے۔ ان کے جامعین بھی سب ایرانی تھے۔ (ہم نے یہاں مختصر اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ جو حضرات تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)۔ مقامِ حدیث اور شاہکارِ رسالت کا مطالعہ فرمالیں)۔

مہاجرین اور انصار کے دو سیاسی پارٹیاں ہونے کے دعویٰ کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں، مملکتِ اسلامیہ کے اعیان و ارکان یہی حضرات تھے۔ کیا آپ کو خلفائے راشدینؓ کی مجالسِ مشاورت (پارلیمان) میں کہیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف (حزبِ اقتدار کی حیثیت سے) مہاجرین رضؓ بیٹھے ہوں اور ان کے مقابل (حزبِ مخالف کی حیثیت سے) انصار رضؓ اور دونوں میں وہ کچھ ہوتا ہو جو سیاسی

پارٹیوں میں ہوا کرتا ہے؛ پارٹیاں کے علاوہ، کیا اس سارے دور میں، ان کے دو متخالف سیاسی پارٹیاں ہونے کی کوئی خفیف سی ...... جھلک بھی دکھائی دیتی ... ہے؟ تو کیا ان کا یہ تحزّب (پارٹیوں میں بٹ جانا) انتخابِ سقیفہ بنی ساعدہ تک محدود رہا! اس کے بعد انہوں نے اپنی اپنی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا؟ اس کے برعکس، ایک عجیب حقیقت سامنے آتی ہے۔ صدرِ اوّل میں (بلکہ اس کے بعد بھی) امورِ مملکت میں نمایاں حیثیت مہاجرینؓ کی نظر آتی ہے لیکن اُمّت میں تعارفی تشخص انصار کا چلا آ رہا ہے۔ "اے۔ ڈی۔ انصاری" اور "ایم۔ تیڈ۔ انصاری" تو آپ کو قدم قدم پر ملیں گے لیکن ڈھونڈے سے۔ "مہاجر" کہیں دکھائی نہیں دے گا۔؎ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انصارؓ نے جو بے لوث خدمات سرانجام دی تھیں، اُمّت کی نگاہ میں وہ اس قدر محبوب تھیں کہ ان کی طرف تعارفی نسبت زندہ جاوید ہو گئی۔ کیا آپ آج کے انصاریوں کو بھی ایک الگ سیاسی پارٹی کے افراد قرار دیں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں مختلف سیاسی پارٹیوں (بالخصوص حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف) کا تصوّر تک بھی دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ عربوں کے ہاں تو ایک طرف (جہاں بطورِ ایک نظام اور ادارہ کے، خود حکومت کا تصوّر بھی، اسلام سے پہلے، موجود نہیں تھا) اس زمانے کی متمدّن ترین مملکتیں (رومی اور ایرانی) بھی اس سے نا آشنا تھیں۔ خود یہ ایک حقیقت بھی اس دعوے کو باطل قرار دے دیتی ہے کہ انصار اور مہاجرین دو سیاسی پارٹیاں تھیں جو اقتدارِ حکومت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں! اس قسم کے دعاوی سب افسانے ہیں۔

(٠)

ہم نے جو کچھ تاریخ کے متعلق کہا ہے (اور اسے پہلی بار نہیں کہا۔ ہم اسے مسلسل دہراتے چلے آ رہے ہیں) اس پر کہا یہ جاتا ہے کہ کیا ہم تاریخ اور روایات کے اس سارے مواد کو دریا بُرد کر دیں؟

کون کہتا ہے کہ انہیں دریا بُرد کر دو! "دریا بُرد نہیں۔ ان کی تطہیر کرو۔ (مثلاً) قرآنِ کریم نے صحابہ کبارؓ (مہاجرین اور انصار) کی جو صفات و خصوصیات بیان فرمائی ہیں، وہ یقینی ہیں اور ان کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اب اگر تاریخ یا روایات میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو ان خصوصیات اور امتیازات کے خلاف ہے تو ہم کہہ دیں گے کہ تاریخ کا یہ بیان صحیح نہیں۔ اس سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ لیکن اگر ہم تاریخ یا روایات کے اس قسم کے بیان کو سچا تسلیم کر لیں تو قرآنِ کریم کی شہادات (معاذ اللہ) جھوٹی قرار پا جائیں گی۔ انہیں جھوٹا سمجھنے سے تو ہمارا ایمان ہی باقی نہیں رہے گا!

لیکن ہمارے ہاں سند اور حجّت تاریخ اور روایات کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی کہ قرآن کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے یا اس کے خلاف جاتی ہے! نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

ہم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اُمّت کو چاہیئے کہ قرآنِ کریم کو یقینی اور آخری سند قرار دے کر تاریخ اور روایات کے لٹریچر کو اس کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ ان میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اُسے صحیح تسلیم کر لیا

؎ ایک آدھ نام کے ساتھ "مہاجر" بھی دیکھنے میں آیا ہے لیکن اس کی نسبت مہاجرینِ مکہ کے ساتھ معلوم نہیں ہوتی۔

جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے حتیٰ کہ اگر آپ اسے ہمارے قدامت پسند طبقہ کے سامنے پیش کریں گے تو (نظری طور پر) وہ بھی اس کی معقولیت کے قائل ہوں گے۔ لیکن (اس کے باوجود) عملاً اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تاریخ و روایات کے مرتبین اور جامعین کا تقدس ان کا جزو ایمان بن چکا ہے اور وہ اس کی ہمت ہی نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ان حضرات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس پر خفیف سی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جائے۔ جب تک یہ ذہنیت باقی رہے گی نہ ہمارے اختلافات رفع ہوں گے اور نہ ہی اسلام اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آسکے گا۔ اختلافات اس لئے ختم نہیں ہوسکیں گے کہ اس لٹریچر میں باہمدگر متضاد باتیں موجود ہیں۔ کوئی فرقہ کسی روایت کے ساتھ متمسک ہے، کوئی کسی اور کے ساتھ — اور ان میں سے کوئی بھی اپنے مسلک میں ذرا سی تبدیلی کے لئے تیار نہیں — اور حقیقی اسلام اس لئے سامنے نہیں آسکے گا کہ اس لٹریچر میں بہت کچھ ایسا ہے جو حقیقی اسلام کے خلاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ کی ایسی غیر مستند حیثیت کے باوجود ہمارے ہاں اسے اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ اس اہم سوال کا جواب بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گا۔ یہ حقیقت قارئین طلوع اسلام کے سامنے صد بار آچکی ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں (بجز چند احکام) دین کے اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات اس نے خود متعین نہیں کیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ان جزئیات کو دانستہ غیر متعین چھوڑا ہے۔ منشاء خداوندی یہ تھا کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں، لیکن ان کی جزئیات، اسلامی مملکت اپنے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق خود وضع کرے۔ یہ جزئیات حالات کی تبدیلی کے مطابق بدلتی رہیں گی۔

ہمارا قدامت پرست طبقہ، اس منشاء و مصلحت خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام نام ہی ان جزئیات کا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ جزئیات عہد رسالتمآبؐ اور دور خلافت راشدہ میں متعین ہوئی تھیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان جزئیات کا کوئی مجموعہ نہ حضور رسالتمآبؐ نے اُمت کو دیا، نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت بالغہ کی رُو سے، غیر متعین چھوڑا ہے ان کے سامنے یہ ارشاد خداوندی تھا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ
تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ
حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعت مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بفرض محال تمہارے مطالبہ پر) انہیں بھی قرآن میں دے دیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکے

گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تم سمجھ لو کہ انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت میں نبی اکرمؐ کی ایک حدیث بھی موجود ہے۔ یعنی:۔

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ (مشکوٰۃ۔ اعتصام بکتاب وسنّت)

اللہ تعالیٰ نے تم پر کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ انہیں ضائع نہ کرو۔ چند چیزیں حرام قرار دی ہیں تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے چند حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور باقی چیزوں کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ تم ان کے متعلق کریدمت کرو، کیونکہ خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا دانستہ کیا ہے۔

یہ تھا قیامت تک رہنے والے دین کا وہ نقشہ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا۔ لیکن ہمارے قدامت پرست حضرات کا عقیدہ ہے کہ خدا کو یہ جزئیات مرتب کر کے دینی چاہئیں تھیں، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ جزئیات عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں متعین ہوئیں اور ان کا قیامت تک غیر متبدل لکھا جانا مقصود و مطلوب تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے روایات کے مجموعے اور کتبِ تاریخ مرتب ہوئیں اور پھر ان میں کریدشروع ہوئی۔ اس کرید سے کسی کو کچھ ملا، کسی کو کچھ (اس لئے کہ ان کتابوں میں تضادات تھے) جس کو جو کچھ ملا، اس نے اسے غیر متبدل دین قرار دے لیا۔ اس طرح مختلف فرقے وجود میں آ گئے، جن میں سے ہر ایک کا اسلام، الگ الگ ہے۔ فقہ کی کتابیں مرتب ہو جانے کے بعد، مزید کرید ختم ہو گئی، کیونکہ ان میں مندرج جزئیات کو غیر متبدل سمجھ لیا گیا۔ یہ کریدامورِ دینیہ تک محدود تھی اور مملکت ان کے دائرے سے باہر تھے کیونکہ ملوکیت، آزاد رہنا چاہتی تھی یا ان میں سے اپنی مصلحت کے مطابق کچھ اختیار کرنا۔

لیکن پاکستان میں صورتِ حالات نے عجیب پلٹا لیا۔ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے کہا یہ گیا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو گا اور اسلامی قوانین نافذ۔ اسلامی قوانین کے متعلق حضرات علماءِ کرام یہ کہہ کر قوم کو بہلاتے رہے کہ یہ ضابطہ کتاب و سنّت کے مطابق مرتب ہو گا۔ بیس سال کے بعد انہیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جس پر تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ (مرحوم مودودی صاحب نے یہ کہا تھا اور اس مشکل کا حل یہ بتایا تھا کہ یہاں فقہ حنفی کو بطور پبلک لاز نافذ کر دیا جائے)۔ فقہ حنفی وہ جزئیات ہیں جنہیں خدا نے دانستہ غیر متعین چھوڑ دیا تھا۔ جب ان جزئیات کی قسط اوّل، حدود کے نام سے نافذ ہوئی ہے تو مرحوم مودودی صاحب نے ان کا ان الفاظ میں استقبال کیا تھا:۔

صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق نے عید میلاد النبیؐ کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بے شمار نعتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسولِ اکرمؐ کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپؐ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپؐ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتدا صدرِ پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ تیئیس سال محروم رہا، اب اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے۔ (ایشیا۔ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء)

ان قوانین کی اہمیت کے متعلق انہوں نے فرمایا:۔

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسول کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔ (ایضاً)

ان قوانین کی خلاف ورزی کا سوال الگ رہا۔ قانون کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہوتی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ

وفاقی شرعی عدالت نے ان قوانین میں سے رجم کی سزا کو خلافِ اسلام قرار دے دیا ہے۔ اور علماء کرام عدالت کے اس فیصلہ کے خلاف شور مچا رہے ہیں! (معلوم نہیں قانوناً ایسی مخالفت کی اجازت بھی ہے یا نہیں؟)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس تمام صورتِ حال کی ذمہ دار (جس سے اسلام کے متعلق جگ ہنسائی ہو رہی ہے) کیا چیز ہے؟ وہی، تاریخ کو غیر متبدل دین کا درجہ دے دینا؛ وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اسے کس سند اور دلیل کی رُو سے مسترد کیا ہے۔ لیکن اسلامی نظریاتی کونسل جس نے اس قانون کو اسلامی قرار دیا تھا اور علماء حضرات جو اس کے اسلامی ہونے پر مصر ہیں، ان کی سند تاریخ ہی ہے۔ قرآن کے تو یہ صریحاً خلاف ہے۔ یہ حضرات خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ ایک اقدام قرآن کے خلاف کیا۔ غنیمت تھا کہ شرعی عدالت نے اس کی تصحیح کر دی لیکن یہ حضرات خلافِ قرآن قانون کو بحال کرنے پر مصر ہیں۔ (پناہ بخدا)

(۰)

یہاں تک بات "مذہب" سے متعلق تھی۔ اب آیئے سیاست کی طرف۔ دعوےٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسلامی نظام کس قسم کا ہوتا ہے، پھر تاریخ کو کریدنا شروع کر دیا گیا ہے۔ اس کرید سے کس کس قسم کی متضاد شکلیں سامنے آتی ہیں۔ اس کے متعلق ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مقام پر صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کے خط و خال کے تعین میں مرحوم مودودی صاحب پیش پیش تھے۔ دیکھئے، ان کی کرید کی رُو سے کس کس قسم

کے متضاد نظریات سامنے آتے تھے۔

(۱) چونکہ ہمارا مرکزی موضوع پارٹی سازی ہے اس لئے ہم پہلی مثال اسی سے متعلق پیش کرتے ہیں۔ مرحوم مودودی صاحب نے جب تک اپنی پارٹی (جماعتِ اسلامی) قائم نہیں کی تھی، اسلام میں پارٹیوں کے وجود کے متعلق ان کا ارشاد یہ تھا کہ

> یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ (پیغامِ حق۔ فروری ۱۹۳۸ء)

اس کے تین ہی سال بعد انہوں نے اپنی پارٹی بنائی، اور نہ صرف یہ کہ اپنے اس اقدام کو مطابقِ اسلام قرار دیا بلکہ اس پارٹی کا نام ہی جماعت اسلامی رکھا اور اسے اقامتِ دین کی علمبردار قرار دیا۔ جب اپنی الگ پارٹی قائم کر لی تو ملک میں عام پارٹی سازی بھی مطابقِ اسلام قرار پا گئی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد کہا کہ

> جماعتِ اسلامی کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون ..... کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ جماعت کو دوسری پارٹیوں سے کوئی کد نہیں لیکن پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۸ اگست ۱۹۶۴ء)

(۲) ——— ملک میں پارٹی سازی کے متعلق پارلیمان کے اندر پارٹیاں بنانے کے متعلق ان کا فیصلہ یہ تھا کہ

> مجلسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔
> (دستوری تجاویز ۱۴)

اس کے بعد جب جماعتِ اسلامی نے پارلیمان میں شمولیت کا فیصلہ کیا، تو اسلام کا دوسرا فیصلہ سامنے آ گیا۔ چنانچہ:۔

> جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔ (کوہستان۔ ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء)

وہ پہلا فیصلہ بھی اسلام کے مطابق تھا اور یہ دوسرا فیصلہ بھی اسلام کے مطابق!

(۳) پارٹی بازی کے بعد، انتخابات کی طرف آیئے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلے انتخابات ۱۹۵۱-۵۲ء میں منعقد ہوئے۔ اس وقت جماعتِ اسلامی کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ اسے انتخابات میں کسی قسم کی کامیابی حاصل ہو سکے۔ اس لئے مرحوم مودودی صاحب نے اعلان فرمایا کہ

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدّوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرائے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا شخص جب اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(جماعتِ اسلامی کی انتخابی جدوجہد)

یہ اُس وقت کے اسلام کا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد، جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے تابع ہونے والے انتخابات میں، انہیں اپنی جماعت کی کامیابی کے امکانات نظر آنے لگے تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ

جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۱-۵۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس لئے ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا ہے کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ (ترجمان القرآن - بابت مئی ۱۹۵۸ء)

سیکولر سیاست میں، پالیسی میں اس قسم کی تبدیلیاں عام ہوتی ہیں۔ انہیں نہ معیوب سمجھا جاتا ہے نہ ناجائز لیکن مرحوم مودودی صاحب اپنی سیاست کو دین کے تابع رکھنے کے مدعی تھے۔ اس بنا پر یہ اعتراض پیدا ہوا کہ انتخابات کے متعلق یہ متضاد فیصلے کس طرح اسلام کے مطابق قرار پائیں گے۔ اس احساس کے ماتحت انہوں نے فرمایا،

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کر لے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

اس کے بعد جماعتِ اسلامی نے ہر انتخاب میں براہِ راست حصّہ لیا۔ انہوں نے انتخاب کے سلسلہ میں اپنی جماعت کا یہ نصب العین بیان کیا تھا کہ

وہ گمراہ اور آزمائے ہوئے غلط کار لوگوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے جو دیندار بھی ہوں اور دیانتدار بھی۔ اور اس کے ساتھ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ (منشور جماعت اسلامی۔ ص۱۳)

ان سے پوچھا گیا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کا کوئی امیدوار جماعتِ اسلامی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو کیا جماعت اس کی حمایت کرے گی؟ انہوں نے فرمایا:۔

اگر کنونشن مسلم لیگ، کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ (امروز۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

اس کے برعکس:۔

اگر ایک ہندو، جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کی نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (ایضاً)

"اکثریت کے نظریہ کے مطابق نظام" کو اصطلاحاً جمہوری کہا جاتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں مرحوم مودودی صاحب مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ مسلمانوں کی اکثریت، مسلم لیگ کے ساتھ ہے، اور ان کا مطالبہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں ان کی اپنی آزاد حکومت قائم ہونی چاہیئے، تو آپ اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، تو ان کا جواب یہ تھا کہ

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

اصولی طور پر، اکثریت کے فیصلوں کے متعلق انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ص۴۵)

یعنی اس وقت اکثریت کے نظام کے متعلق اسلام کا فیصلہ یہ تھا کہ اور اس کے بعد ایک ہندو کو اس لئے ترجیح دی جاتی تھی کہ وہ اکثریت کے نظام کے حق میں تھا۔

(۴) ایک اور مثال۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اسلامی نظامِ حکومت میں صدر مملکت کے اختیارات کیا ہوں گے؟ مرحوم مودودی صاحب نے فرمایا:۔

جب امیر چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا، امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔

اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

(اسلام کا نظریہ سیاسی)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں، انہوں نے ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

امیرِ مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا۔

جماعتِ اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلہ میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۲۶ میں یہ کہا گیا تھا کہ

امیر کو مجلس کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہو گا۔

یہ اُس وقت کے اسلام کا فیصلہ تھا۔ (بدقسمتی سے) اس کے بعد صدر ایوب خان (مرحوم) کا دور آ گیا، جن کے مرحوم مودودی صاحب سخت مخالف تھے۔ اس وقت سوال یہ اٹھا کہ صدر کے اختیارات کیا ہوں گے؟ ترجمان القرآن کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا سوال اور مرحوم مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ——— صدرِ ریاست کو ویٹو کا حق۔

مستفسر نے یہ کہا تھا کہ عام طور پر یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ صدرِ مملکت کو ویٹو کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تائید میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ان فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے جن میں انہوں نے ویٹو کا حق استعمال کیا تھا۔ مرحوم مودودی صاحب نے جواب میں کہا ... کہ یہ تجویز اسلام کے خلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جن فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ ویٹو کی رُو سے فیصلے نہیں تھے۔ صدرِ مملکت کو ویٹو کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہم نے یہ مثالیں، یہ بتانے کے لئے پیش نہیں کیں کہ مرحوم مودودی صاحب مختلف اوقات میں متضاد فیصلے دیا کرتے تھے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر اسلام میں سند، صدرِ اوّل کی تاریخ (جس میں روایات بھی شامل ہیں) کو قرار دے لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے ہر نظریہ کے موافق اور مخالف سندات مل سکتی ہیں۔ مرحوم مودودی صاحب اپنے ہر متضاد فیصلے کی تائید میں کوئی نہ کوئی تاریخی سند پیش فرمادیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے تو ان کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی۔ اس کا انہیں ذاتی تجربہ تھا کہ کتبِ تاریخ و روایات میں ہر متضاد نظریہ کی تائید میں سندات مل سکتی ہیں۔

(جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں) مذہبی فرقہ بندی کی بنیاد بھی انہی سندات پر ہے۔ اُمت کے لئے یہ تفرقہ انگیزی بھی کچھ کم تباہی کا موجب نہیں لیکن جب یہ انداز سیاست میں اختیار کیا جائے، تو اس سے ایسا انتشار پیدا ہو سکتا ہے جس سے خود مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جائے۔ مذہبی فرقوں کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے جو عقائد اور مسالک اختیار کر لئے ہیں، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا ہے۔ (مثلاً) اگر اہلحدیث حضرات کے نزدیک نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا شریعت کے مطابق ہے، تو ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ وہ کبھی سینے پہ ہاتھ باندھنا مطابق شریعت قرار دے لیں، اور کسی وقت زیرِ ناف ہاتھ باندھنا مطابق شریعت تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر امورِ مملکت کو اسی "اسلام" کے تابع رکھا گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ آج آئین کی ایک شق کو شریعت کے مطابق

تسلیم کیا جائے گا کل کو (دوسری پارٹی) شریعت کا متضاد فیصلہ لے آئے گی جس سے وہ شق کالعدم قرار پا جائے گی۔ ابھی تو دو چار قوانین سامنے آئے ہیں۔ "کتاب وسنت" کے مطابق، نظامِ مملکت یا اسلامی آئین کا کوئی ڈھانچہ مرتب کیجئے اور پھر دیکھئے کہ "کتاب وسنت" ہی کی رُو سے، اس مسودہ کی کس طرح دھجیاں اُڑتی ہیں۔ واضح رہے کہ "کتاب وسنت" میں کتاب (قرآن) کا لفظ محض برائے وزنِ بیت شامل کیا جاتا ہے۔ اصل سند "سنت" کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور "سنت" مشتمل ہے ان تاریخی اور روایاتی حوالوں پر جن کا تذکرہ سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ (مثال کے طور پر) رجم کی سزا بہ نصِ صریح قرآن کے خلاف ہے۔ اسے مطابقِ اسلام قرار دینے والے تاریخی سندات سے ایسا کرتے ہیں۔ قرآن کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس صورتِ حالات کا نتیجہ کیا ہے؟ اسے ہم اپنی سابقہ اشاعت (بابت اپریل ۱۹۸۱ء) میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس مقام پر اس کے اساسی نکات کو دہرایا جاتا ہے۔

(۱) مملکتِ پاکستان کا وجود اس لئے عمل میں لایا گیا تھا کہ اس میں اسلام اپنی منزہ شکل میں روبعمل ہو سکے۔

(۲) اس سے اقوامِ مغرب کو (خواہ وہ نظامِ سرمایہ داری کی حامل تھیں اور خواہ اشتراکی نظام کی) خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس مملکت میں قرآنی نظام قائم ہو گیا تو اس کے سامنے ان کے کسی نظام کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ اس لئے انہوں نے تدبیر اسی میں سمجھی کہ قرآنی نظام یہاں قائم نہ ہونے پائے۔ اس کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ اُس اسلام کو حقیقی اسلام مشہور کر کے اسے اجاگر کیا جائے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کی سندات تاریخ سے ملتی ہیں۔ اسے (FUNDAMENTALISM) کی تحریک کہا جاتا ہے۔

(۳) ان سندات کا پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ کوئی متفق علیہ نظام یا ضابطہ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے علاوہ اس کے کہ یہ ملک مستقل خلفشار کی آماجگاہ بنا رہے گا، دنیا میں یہ تأثر عام ہو جائے گا کہ اسلام ایک جلا ہوا کارتوس ہے جو کسی زمانے میں تو زندہ قوت تھی لیکن اب روبعمل ہو نہیں سکتا۔ اس تأثر کے تحت مسلمان قومیں سیکولر نظام کی طرف آنے پر مجبور ہو جائیں گی۔

(۴) اور اسلام کے نام سے اس طرح کے قوانین مرتب کئے جائیں جنہیں دیکھ کر ہماری نوجوان نسل نفسِ اسلام ہی سے برگشتہ ہو جائے۔ (جیسا کہ قرآنِ کریم نے آیت ۵/۱۰۴ میں متنبہ کیا تھا) آپ ریفرنڈم کرائیے اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے پوچھئے کہ وہ ان قوانین کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ان کا جواب بتا دے گا کہ خود نفسِ اسلام کے متعلق وہ کس مقام پر پہنچ چکے ہیں؟ وہ محض معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے اسے زبان پر نہیں لاتے، ورنہ وہ دل میں اس سے منحرف ہو چکے ہیں، یا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم رونا روتے رہتے ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم (بلکہ کمیونزم) سیلاب کی طرح اُمڈے چلا آ رہا ہے۔ یہ صحیح ہے، لیکن ہم اتنا نہیں سوچتے کہ ایسا ہو کیوں رہا ہے؟ ذرا تعمق سے حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ کمیونزم کو ہم خود آوازیں دے دے کر بلا رہے ہیں۔ مشہور فلاسفر پسکال نے لکھا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ وہ جب خدا پر ایمان چھوڑ

دیتا ہے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ (انسان نے کیا سوچا؟ صفحہ ۳۲۹)

ہم اپنے نوجوانوں سے (مار مار کر) خدا پر ایمان چھڑا رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ "شیطان" کی پرستش کرنے لگ جائیں۔

اس طرح اقوامِ مغرب کی وہ اسکیم کامیاب ہو رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

کتنی گہری ہوتی ہیں ان قوموں کی اسکیمیں! ساری دنیا میں غلغلہ مچ رہا ہے کہ اسلام کا فروغ ہو رہا ہے اس فروغ کیلئے یہ قومیں ہمارے ممالک میں سامان و ذرائع اور سہولتیں اور آسائشیں مہیا کر رہی ہیں۔ اس کے لئے ہم ان کے ممنونِ احسان ہوتے ہیں، اور کبھی نہیں سوچتے کہ قصاب بکرے کو اس لئے پالتا ہے کہ اس نے اسے ذبح کرنا ہوتا ہے۔ اقبالؒ عمر بھر قوم کو ساحرینِ فرنگ کی اس سازش سے متنبہ کرتا رہا، لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ ذرا سوچئے کہ اس نے جب ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج ۔ صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام (ارمغانِ حجاز)

تو کسی نے یہ نہ سوچا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! انہوں نے اپنی عمر کے آخری ایام میں، زبانِ شعر کے رمز و ایما کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور برہنہ حروف میں کہہ دیا کہ

مولوی کا ذہن پچھلے سو برس سے عقیم چلا آتا ہے۔ دیوبند کو دیکھئے۔ وہ بھی انگریزی شاہنشاہیت کی غیر ارادی تخلیق ہے۔ (اقبالؒ کے حضور۔ صفحہ ۲۸۲)

ان حضرات پر ..... جو مشہور کرتے رہتے ہیں کہ دیوبند، اسلامی حکومت کے قیام کا مدعی چلا آ رہا ہے، علامہ اقبالؒ کی یہ حق گوئی گراں گذرے گی، لیکن اس کا کیا علاج کہ علمائے دیوبند خود "اقبالؒ" کی تائید کرتے ہیں۔ مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی علما ہی سے ہیں۔ انہوں نے ایک مقالہ میں جو ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۷ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا، کہا تھا:-

> یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دار العلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح العین قرار دے لیا تھا۔

یہی اقوامِ مغرب کا منشا تھا۔

اس زمانے میں اسلامی تعلیم کا سرچشمہ صرف دیوبند تھا۔ آج قدم قدم پر "دیوبند" کھلے ہوئے ہیں۔ نیازی (مرحوم) نے لکھا ہے کہ حضرت علامہؒ نے یہ الفاظ انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں اکھڑی اکھڑی سانس سے ـــــ بمشکل ادا کئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقوامِ مغرب کی اس سازش کے احساس سے ان کا قلب کس قدر مضطرب تھا! چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔ آج وہ سازش کس قدر عریاں حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ ع

طبِّ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

اِن اقوام کے ہاتھوں ہم بُری طرح مات کھا گئے، اور ہمارے ہاتھوں اسلام مات کھا رہا ہے۔ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ۝ (۲۲/۱۱) ع۔ نہ کیسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین۔

اِس کا توڑ صرف قرآن کی ضربِ کلیمی ہے۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ اس سے پہلے قرآنی نظام کے داعی کو اپنے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب اُن کی پشت پر اقوامِ مغرب بھی ہیں۔ اِس لئے اُسے ان دونوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا جو بڑا صبر آزما ہوگا۔ یہ فرعونؔ اور ہامانؔ دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ جس کے لئے کسی بڑے باہمت مردِ مومن کی ضرورت ہوگی۔ ع

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد ہے

—(۶)—

آخر میں ہم دو ایک ایسے اعتراضات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جو اس باب میں عام طور پر وارد کئے جاتے ہیں۔

(۱) کہا یہ جاتا ہے کہ اگر قوم میں پارٹیاں بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، تو یہ (ONE PARTY GOVT) ہو جائے گی، جو ڈکٹیٹرشپ کا دوسرا نام ہے۔ سیکولر نظام میں ایک انداز یہ بھی ہے کہ اربابِ اقتدار قوم میں سے اپنی پسند کے افراد کو اکٹھا کر لیتے ہیں، اور زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وہ قوت کے بل بوتے پر، باقی قوم پر حکومت کرتے ہیں، یہ یک۔ جماعتی نظام کہلاتا ہے جو واقعی آمریت ہے۔ لیکن قرآنی نظام میں یہ صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اس میں اُمّت میں ایک پارٹی نہیں، بلکہ پوری کی پوری اُمّت شریکِ حکومت ہوتی ہے۔ قرآن میں مشاورت کا حکم پوری اُمّت کے لئے ہے۔ قرآنی نظام قائم کرنے والوں کا فریضہ ہوگا کہ وہ سوچیں کہ بحالاتِ موجودہ، اِس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ یہ (ONE PARTY GOVT) گورنمنٹ نہیں، بلکہ (PARTY LESS) گورنمنٹ ہوگی۔ چونکہ ہم مغرب کے جمہوری نظام کے خوگر ہو چکے ہیں، اِس لئے اس قسم کی حکومت کا تصور ہمارے ذہن میں فِٹ نہیں بیٹھتا۔ اِقبالؒ نے اِن حضرات کی اِس دشواری کے پیشِ نظر کہا تھا کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے　　　تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

یہ تو ہے مغرب زدہ ذہنیت۔ جہاں تک مذہبی ذہنیت کا تعلق ہے، اس کے متعلق اگلے شعر میں ہے ؎

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے　　　طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے

(۲) دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو سند اور حجت تسلیم کر لیا جائے، تو اس کی تعبیرات (INTER PRETATION) میں فرق ہوگا، اور اس سے قوم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اِس قسم کا اعتراض کرنے والے قرآن کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اگر (جیسا کہ معترضین کا خیال ہے) قرآن واقعی ایسی کتاب ہے جس کے احکام کی تعبیرات میں اختلاف۔۔۔ ہو سکتا ہے تو اس سے اس کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی باطل قرار پا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ۝ (۴/۸۲)۔ اگر یہ خدا کی کتاب نہ ہوتی، کسی اور کی ہوتی

تو اس میں بہت اختلافات پائے جاتے۔ اس کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ قرآن میں عدمِ اختلاف کے معنی یہ نہیں کہ اس کے متن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دعاوی اور احکام میں کوئی اختلاف نہیں۔ تعبیرات یا استنباط میں اختلاف خود کتاب کا اختلاف ہوگا۔

قرآن کریم نے بہ ہیئت مجموعی اصولی احکام دیئے ہیں، اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے طریق وضع کرے جن کے مطابق ان اصول احکام پر عمل کیا جائے۔ حالات کے اختلاف سے ایک ہی حکومت، اپنے سابقہ اختیار کردہ قواعد و ضوابط میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ اور بعد میں آنے والی حکومت بھی۔ یہ اختلافات، قرآنی احکام کی تعبیرات کا اختلاف نہیں۔ قرآنی احکام کے روبہ عمل لانے کے طریق کا اختلاف ہے۔ آپ مختلف فرقوں میں جو اختلاف دیکھتے ہیں، اس کی وجہ قرآن کی تعبیرات کا اختلاف نہیں۔ قرآن کو تو یہ حضرات درمیان میں لاتے ہی نہیں۔ انہوں نے کسی سابقہ زمانے کے عملی طریق و ضوابط کو غیر متبدل اسلام قرار دے رکھا ہے، اور ہر فرقہ اس کا مدعی ہے کہ اس کے اختیار کردہ قوانین شریعت "کتاب و سنت" کے مطابق ہیں۔ اسے سطح بین لوگ قرآنی احکام کی تعبیرات سمجھ لیتے اور پھر یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ قرآن کی تعبیرات مختلف ہو سکتی ہیں۔ جب اسلامی حکومت قرآن کو سند و حجت قرار دے کر اس کے احکام و اصول کو نافذ کرنے کے طرق و اسالیب اختیار کرے گی، تو یہ قرآن کی تعبیرات نہیں ہوں گی۔ اس کے احکام کی تنفیذ کے مختلف طریقے ہوں گے۔ یہ طریق اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اسلامی حکومت امت کے مشورہ سے قائم ہوگی۔ قرآن کریم میں مشاورت کی دو آیات آتی ہیں۔ اور ان دونوں کے مفہوم میں بڑا لطیف اور عمیق فرق ہے۔ ایک آیت میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) اور دوسری آیت میں امتِ مسلمہ کے متعلق ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ الفاظ دونوں آیتوں کے ایک جیسے ہیں لیکن ان الفاظ کی ترتیب میں جو فرق ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ "امر" کے معنی امور مملکت یا حکومت ہیں.... رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ آپ امورِ مملکت کے بارے میں جماعتِ مومنین سے مشورہ کیا کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکت خود حضورؐ نے قائم فرمائی تھی۔ حضورؐ اس کے سربراہ تھے لیکن آپ کی یہ سربراہی اُمّت کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ منصبِ رسالت کی حیثیت سے حضورؐ اس کے آدلین سربراہ تھے۔ جب اُمّت کو مشاورت کا حکم دیا گیا تو کہا گیا کہ ان کی مملکت، حکومت، باہمی مشاورت سے قائم ہوگی۔ یعنی اسلامی حکومت کا قیام (سربراہِ مملکت کا انتخاب) بھی مشورہ سے ہوگا اور پھر جملہ امورِ مملکت بھی مشورہ سے طے پائیں گے۔ اس کی وضاحت حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ لا خلافة الا عن مشورة۔ "کوئی مملکت جو مشورہ کے بغیر قائم ہوئی ہو، خلافت (اسلامی) نہیں کہلا سکتی۔" (کنز العمال) دوسری جگہ ہے: من بایع عن غیر مشورة المسلمین فانہ

لا بیعۃ لہ ؕ[۱] (تاریخ طبری) "جو شخص عام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی شخص کو امیر قرار دے کر بیعت کرے گا تو اس کی بیعت کالعدم قرار پائے گی۔ ان ارشادات سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکومت جو امت کی رضامندی اور مشورہ کے بغیر قوت کے بل بوتے پر مسلط کی جائے، اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ اور دوسری یہ کہ بیعت شہادت کسی ایک پارٹی کی نہیں بلکہ پوری کی پوری امت کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب تو سقیفہ بنی ساعدہ کے مختصر سے اجتماع میں عمل میں آیا تھا لیکن دوسرے دن عام امت کے تمام ارکان نے آپ کی بیعت مسجدِ نبویؐ میں آکر کی تھی جس میں مہاجر اور انصار سب شامل تھے۔

یہ ہے اسلامی حکومت کا مختصر سا ہیولیٰ۔ لیکن اسے قائم کرنے کے لئے بڑے اولو العزم مردانِ مومن کی ضرورت ہوگی جو مذہبی پیشوائیت اور مغربی استعماریت دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔

---

[۱] بحوالہ اسلام کا نظامِ حکومت۔ از مولانا حامد الانصاری (مرحوم)۔ صفحہ ۳۲۹

ایک مدت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے نہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:-

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے:-

★ مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔ ★ مالکیتِ زمین کا قدیم تصور کی بنیادیں کس طرح ناستوار ہیں۔

★ ربو (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ ★ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ــــ ضخامت سوا چار سو صفحات ــــ سنہری جلد

قیمت فی جلد پچاس روپے ــــــ (علاوہ محصول ڈاک)

★ ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآن کا مقام

۱۔ کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز :۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے (فیصلے نہیں کرتے) انہی کو کافر کہا جاتا ہے

۲۔ قرآن کے ساتھ کچھ اور نہیں ملایا جا سکتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۳۔ رسول اللہؐ کو ارشادِ خداوندی : فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ..... (۵/۴۸)

لوگوں کے معاملات کے فیصلے منزل من اللہ کتابِ خداوندی کے مطابق کیا کرو۔

۴۔ حضورؐ کا اعلان :۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ..... (۶/۱۱۴)

(کیا تم چاہتے ہو کہ) میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم (فیصلہ کن اتھارٹی) تسلیم کروں، جس نے تمہاری طرف یہ مفصل کتاب نازل کی ہے۔

۵۔ ہر اختلاف اسی کی رو سے مٹے گا :۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ... (۴۲/۱۰)

جس معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو ان کے فیصلے کے لئے خدا (کی کتاب) کی طرف رجوع کرو۔

۶۔ بارگاہِ خداوندی میں حضورؐ کی شکایت :۔

قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

اور رسول پکار اٹھے گا کہ اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

(غور کیجئے۔ اس میں صرف ترکِ قرآن کا ذکر ہے)

۷۔ ترکِ قرآن کے بعد :۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵)

جب ان کے سامنے خدائے واحد (کی اطاعت) کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ بات ان پر سخت گراں گذرتی ہے اور جب اللہ کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انہیں خدا کے سامنے جانے کا یقین نہیں۔

لہٰذا، کفر اور اسلام۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ یہ خود خدا کا فیصلہ ہے۔ اور یہی اسلام ہے۔

ماہرینِ قانون حضرات توجّہ فرمائیں

۱- آئینِ پاکستان کی رُو سے
مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو قرآن اور سنّت کے خلاف ہو۔

۲- وفاقی شرعی عدالت کا فریضہ ہے کہ
جو قانون قرآن و سنّت کے خلاف ہو اسے کالعدم قرار دے دے۔

۳- سوال غور طلب یہ ہے کہ اگر کسی قانون کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے تو کیا اس کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت باقی رہے گی کہ وہ سنت کے بھی خلاف ہے یا نہیں؟

ہمارے نزدیک تو اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کا خلافِ قرآن ہونا اس کے خلافِ اسلام ہونے کا ثبوت ہوگا۔

۴- اگر کوئی قانون، قرآن کے خلاف ہو اور سنّت کے مطابق، تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی؟ کیا وہ اسلام کے مطابق تصوّر کیا جائے گا یا اس کے خلاف؟

۵- ماہرینِ قانون حضرات سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم اس قانونی نکتہ پر غور فرما کر اپنی رائے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

واضح رہے کہ ہم اس وقت تاریخ کے بڑے نازک مقام پر کھڑے ہیں۔ ہمارا ایک غلط فیصلہ نہ معلوم کتنے انسانوں کی گمراہی کا موجب بن جائے اور اس سے کتنوں کی عاقبت تک خراب ہو جائے۔ لہٰذا، جو حضرات ان امور میں درک رکھتے ہیں ان پر فریضۂ خداوندی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کو مشورہ دیں۔

ایک سوال اور

آئینِ پاکستان کی حالیہ ترمیم کی رُو سے، ہر فرقہ اس کا مجاز ہے کہ پرسنل لاز کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرے۔ کیا مذہبی فرقوں کی ایسی فہرست دی گئی ہے جسے اس مقصد کے لئے قانون تسلیم کرتا ہو! اگر نہیں تو پھر یہ کیسے طے ہوگا کہ یہ فرقہ کون سا ہے اور اس کی فقہ کونسی؟

(-)

پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۴۰ روپے

مکمل سیٹ -/۱۵۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ محنت شاقہ کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت:۔ مکمل سیٹ -/۱۲۵ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکر قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۵۰ روپے

مکمل سیٹ مجلد -/۱۵۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درس قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے کے محاورۂ عرب اور تصریف آیات قرآنی سے آیات قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مدلل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے ابھی تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ آفسٹ چھپائی۔

قیمت:۔ جلد اوّل -/۵۰ روپے جلد دوم -/۵۰ روپے جلد سوم -/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

بتقریبِ یومِ اقبالؒ

باسمہٖ تعالیٰ

اسلامی مملکت کا تصوّر

(اقبالؒ کے نزدیک)

پرویز

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲۲/۵۲)

اے رسولؐ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے۔

رسولؐ کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقتدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا جو بندگی، پرستش یا مختلف رسوم کی رُو سے انفرادی طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآنِ کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے) مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۭ ...... (۲/۷۹)

یہ خود شریعت وضع کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے

کے لئے کرتے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔

خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ..... (۶/۱۱۶)

خدا نے اس وحی کی رُو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

اس لئے کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہوگا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟..... نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیّر و تبدّل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش! لیکن ہوا یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو

اسلام مذہب بن گیا

محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ وہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۰/۳۲)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہؐ کے بعد خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبیؐ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) محکم کیا جائے۔ (ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ) آیاتِ قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل۔ جائز و ناجائز۔ صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے لیکن یہ

فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ اُمّت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار، قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتبِ سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔

استحکام آیات اللہ کا عملی طریق

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ... (۲/۲۱۳) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ ــــ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ... (۵/۴۸) "تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو"۔ اس اُمّت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ط (۴۲/۱۰)

اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔

حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)۔ اس فریضہ کو اُمّت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعت خداوندی قرار دینے کے بجائے کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطۂ نظام قرار دینا، اُمّت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آ کر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

(۰)

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمّت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدّین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ حقیقت کو اُمّت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختمِ نبوّت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر غور و تدبّر اور اسوۂ رسول اللہؐ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے، اس میں روش روش پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت

کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائدِ اعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات، اور شخصی قوانین کی آزادی اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں۔ اور یہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، اُمت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہیٰ۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ؎

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم، نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ نے قرآن کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا، اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی اور پھر ؎

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت مستحکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——— آفریدی شرعِ و آئینے دگر ——— اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ ——— اندکے با نورِ قرآں درنگر۔ اپنے آئینِ حیات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لو۔

یہی تھا وہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں، میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں، ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور سنہ ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ میری یہ تصریحات بیشتر انہی اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ یہ خطابات انگریزی زبان میں ہیں۔ یہاں ان کا اردو ترجمہ پیش کیا جائے گا

کیونکہ لفظی ترجمہ سے مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

(۰)

آپ نے سنہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت

آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ و پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اسکی فطری وسعتوں میں ازنِ بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر، بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کلیسائی نظام نہیں جس کا مقصود خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اِس نظری بحث کے بعد وہ اُس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا)۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[ط] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے ..... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر ثبت ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے یہ نہ صرف اپنی حقیقی روح سے قریب تر ہو جائیں گے بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی ہم دوش ہو جائیں گے۔

ط اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطباتِ تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> اندریں حالات ہمارے لئے کشادکار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہیٰ و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطباتِ تشکیلِ جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

(۰)

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں۔ نہ اس کی "پارلیمان" میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کی تقسیم و تفریق ہوتی ہے۔

واحد ضابطۂ قوانین

اس مملکت یا اُمت کا ایک ضابطۂ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے، اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابطِ قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن جس مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں؟ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیرؤں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور "معرکۂ دین و وطن" مملکت کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔

نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہوگا جس میں پرسنل اور پبلک لاء کی تفریق نہیں ہوگی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جس کے ضروری اقتباسات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گے۔

(۰)

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمتِ قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآن مجید کی عائد کردہ ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱) "کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر، نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے"۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیرِ نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیرِ استحکامِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ ؎

نفسیاتی تغیر شرطِ اوّل

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود!

"چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ (تصوف کا تزکیۂ نفس نہیں) خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف (بالِ جبریل)

انسانی ضمیر پر "نزولِ کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیرِ نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا لینے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افرادِ ملت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ ؎

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

"وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے"۔ اور یہ مقصد احکامِ قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ؎

نیست ایں کار فقیہاں اے پسر

"یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں"۔ یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ ـــــ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ ـــــ قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے افراد کی تعمیر خودی کرتے تھے۔ تشکیل مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ یعنی افراد کی تیاری جن کے ہاتھوں اس مملکت کو قائم ہونا تھا۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہرحال قوانین کی رُو ہی سے چلنا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ باصرار و تکرار اس حقیقت کو دہرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ ؎

زیر گردوں سرّ تمکین تو چیست | ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست
حکمت او لایزال است و قدم! | آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم

قرآن کا انداز

لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعیّن کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمّت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطۂ راہ نمائی قرار پانا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شدّ و مد سے دہرایا ہے۔ وہ خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں:۔

> اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود، تغیر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے

ثبات و تغیر کا امتزاج

> پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دورہ ہے، ابدی اصول ہی تو وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے مطابق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ

تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو اور جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی ایسی قوم نہیں جس کے پاس اس قدر

احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّیٰ سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا، یہ بھی

اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے۔ (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ

بااین ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

(۱)

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی عہد انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ

نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اُصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب

تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہِ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے اِن اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوتے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکمِ خداوندی تھا کہ

شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ...... (۳/۱۵۹) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا، اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ...... (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور اُن سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ———— اس مسلک پر حنفی فقہا نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا مآخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رو سے اس سے بلتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ———— علامہ اقبالؒ اس کی نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ

میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

(۰)

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدّل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیّر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

وہ سب سے بڑا سوال جو اِس وقت اُس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدّوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

روحِ عمریؓ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیا کے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوّت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے، اور وہ

عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

(۰)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت اُسے کہا جائے گا جس میں تمام کاروبارِ مملکت قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائیں۔ یہ مملکت قائم بھی ان افراد کے ہاتھوں ہوگی جن کی سیرت قرآنی قالب میں ڈھل چکی ہوگی۔ اس مملکت میں قانون سازی کا اصول یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے اصول، اندازِ قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور انہیں روبہ عمل لانے کے لئے جزئی قواعد زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یہ قواعد خود اسلامی مملکت متعین کرے گی۔

اس قسم کی حکومت قائم کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس مملکت کے قیام کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ ہمارے دورِ ملوکیت میں جس قسم کا اسلام وجود پذیر ہو گیا تھا اسے ہٹا کر اس کی جگہ قرآنی اسلام رائج اور نافذ کیا جائے۔ ہمارے دورِ ملوکیت کا اسلام ان فقہی احکام میں ملبوس چلا آرہا تھا جس کی علمبردار مذہبی پیشوائیت تھی۔ مذہبی پیشوائیت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان فقہی احکام کو غیر متبدل قرار دیکر انہیں مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔ اس انداز حکومت کو تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے بالفاظِ دیگر، مملکتِ پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ مسلمانوں میں مقیاکریسی باقی نہ رہے۔ وہ تمام عمر تھیاکریسی کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔

تھیاکریسی کے خلاف

انہوں نے (مولانا) اکبر شاہ خان نجیب آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ (انشاء اللہ شائع ہوگا) مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملہ کے متعلق مفصل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آجکل بہت سوچ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ (انوارِ اقبالؒ۔ صفحہ ۳۱۷)

انہوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں (پاکستان کا تصور دینے کے بعد) اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ ادھام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنیوالے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر وہ نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۷۸ء)

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تھا، اور قائدِ اعظمؒ کی مساعیٔ حسنہ نے اسے حاصل کر دکھایا تھا۔ اس کے بعد اس خطۂ زمین پر کیا بیتی، اس کے متعلق اقبالؒ کے ان الفاظ سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ

(۰)

بیادِ اقبالؒ و سفیرِ اقبالؒ

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ کو بلادِ عربیہ سے متعارف کرانے کا سہرا، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مرحوم) کے سر ہے۔ انہوں نے حضرتِ علامہ کی اہم کتابوں کا، عربی نظم میں ترجمہ کر کے ان ممالک میں شائع کیا تھا۔ اس حد تک تو غالباً اکثر حضرات کو علم ہو گا، لیکن اس کا علم بہت کم افراد کو ہو گا کہ ان کتابوں کے یہ تراجم کب ہوئے تھے، کہاں ہوئے تھے، اور کس طرح ہوئے تھے۔ یہ کراچی میں اس زمانے میں ہوئے تھے جب ڈاکٹر عزام مرحوم، سفیرِ مصر کی حیثیت سے کراچی میں قیام پذیر تھے، اور اُس حلقہ، فکرِ اقبال میں ہوئے تھے جسے مرحوم نے "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" کہہ کر پکارا تھا۔ اس مجلس کی ان نشستوں کی روئداد یکے از قلندران، محترم خورشید عالم صاحب نے اسی زمانے میں قلمبند فرمائی تھی جو (۱۹۵۵ء میں) ہفت روزہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ چونکہ یہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے اس لئے ہم نے اس کی یاد تازہ رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے روئدادِ "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ"۔

(۰)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ سفیرِ مصر، اُن سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکتِ مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر کم متحیر نہ تھے کہ پیغامبر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبۂ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبالؒ سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انہیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت، اقبالؒ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں طالب علمانِ اقبالؒ سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ملاقات سے ردِّ عمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرد تمنائے ملاقات سے قدرتاً پیدا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے معذوری کا اظہار کیا، لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحبؒ سیکرٹری مجلسِ اقبال) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحبِ موصوف کی

ؒ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

طلبِ صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانۂ مصر میں ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب وہاں خود چلے گئے تھے ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری (بلکہ منافقت کا لفظ زبان پر آرہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بباطن خبیث، دختران مادر ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سود و سودا مکر و فن" سے معمور رہے نہ کہ "سوز و مستی جذب و شوق" سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم نماو جو فروش میں ان درویشوں کا کیا کام اور کہاں گذر جن کے قلوب و اذہان میں قرآن اور اقبالؒ نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ سکونِ گہر بھی ہو۔ جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں، اور جن کی حالت یہ ہو ؎

زبرونِ در گذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں" سفیر مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمائندۂ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں، وہ درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبالؒ ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اُس دنیا میں تھے، جہاں تمام حجابات یک لخت اُٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے، من تو شدم تو من شدی، کی حقیقی "اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" کا نقشِ اوّل بنی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکانِ مجلس کی کشتِ جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا۔ تا آنکہ ایک وقت اسے "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" کہہ دیا گیا، اور پھر اُسے یہی کہا جانے لگا۔ بہرحال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے، اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے۔ یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آئندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں، اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر از اوّل تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنہوں نے پیغامبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انہیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انہیں بھی شریک کر لیا جائے۔ لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریکِ مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تیاری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ غذا تھی جس کے بغیر نہ سینے کی کشود ممکن ہے نہ قلب کا حضور، اور جب یہ دولت ہاتھ آجاتی ہے تو کوئی اس کو بہ قیامِ ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور قلندرانِ اقبال کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیلِ محالات ہے ؎

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم!
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع، کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جن کے نزدیک گردشِ لیل و نہار کا "معیار" اوقات ہماں بود کہ بایار بسر رفت" ہو، انہیں ہر وقت یہ خلش احساس رہتی ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد" مجلس کے لئے دن کا کوئی تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی، ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کی حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست ہونے سے پیشتر یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات۔ انہیں بہر حال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ ورنہ کوئی اور مصروفیت آئندہ یوم انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابلِ دید ہوا کرتا تھا۔ "آئندہ کب؟" کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگوا لیتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں۔ گو انتظار کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب "سودا بازی" شروع ہو جاتی۔ چلئے ہم صبح صبح آجائیں گے۔ اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آئیے اور پھر شب درمیان ہو گی بہت سا حساب بیباق ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بے ساختگی سے کہا "حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ" اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ذوقِ حضور دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے"۔ "یہ ٹکڑہ زیادہ غور طلب ہے"۔ "اسے ایک ہی نشست میں نپٹا لینا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ سب کو رہ رہ کر خیال (اور بہت حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آرہا

ہے۔ سفیر صاحب ہیں کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی جلدی نہیں، تیار ہو کر چلے جانا ہے۔ چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ۔۔۔ تا آنکہ ایک منٹ کا پس و پیش خلافِ مصلحت ہو جاتا۔ اور سب بادلِ نخواستہ اُٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصوّر سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطورِ بالا سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ مجلس قلندرانِ اقبالؒ میں مناصب کی تقسیم نہیں ہو گی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرضِ وجود میں نہیں لایا گیا، اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام اندازِ معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں، اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے، اور اس طریق سے جیسے وہ پہلے سے "مقدّر" تھے۔

سب سے بڑا "عہدہ" پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندران کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی۔ ہر چند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباسِ تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب نے اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبالؒ پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے اور اپنے مطالعہ اقبالؒ اور تدبّر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انہیں شیخ قلندران کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انہیں "سفیرِ اقبالؒ" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبالؒ کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلامِ اقبالؒ کا عربی میں ترجمہ کر کے آپ نے پوری دنیائے عرب کو فکرِ اقبالؒ کے نور سے منور کر دیا۔ اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیرِ اقبالؒ" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا، آج وہی ساقی، ساقی گری کی شرم رکھ کر اس اُجڑی محفل کی بادکو دل و دماغ میں بسائے اس کی داستان گوئی کا فرض ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلاوجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدرِ ظرف عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے (میں نے اس وقت انہیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انہیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا) جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسا ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخ قلندران اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بے ساختہ داد دی گئی۔ اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آ پڑی۔ چائے کے ساتھ ..... کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا۔ اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی، ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا۔ تقسیم کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا۔ قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے۔ ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی، ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے، پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ پوچھئے نہیں۔ دس بارہ قلندر جن کی ہر لحظہ نئی شان، نئی آن" اسے کم دودھ، اُسے تیز قہوہ، یہ اتنی شکر،

وہ اتنی سشکر مجلسِ قلندران کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخیٔ چائے کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہن کی آزمائش کیا کرتے تھے۔ ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدِ نظر رکھنا پڑتی تھی۔ ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ قریباً ہر محفل میں دونوں، آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ وہ اہلِ محفل سے پوچھے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو ان کا جواب "بلیٰ" ہوگا۔ قلندروں کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ ہاں تو، یہ قاسم تھے سب کے ہر دلعزیز، عزیز الحسن۔ (جواب مرحوم ہو چکے ہیں)۔

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے۔ یہ ان خدامِ مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبالؒ کو نہ پا سکے، لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے۔ ابراہیم، خمیس، محمد وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدامِ خانہ تھے۔ وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بے تابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑا سے بڑا قلندر کر سکتا تھا۔ دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا۔ وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے۔ یہ ذہنی طور پر ہمارے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے۔

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبالؒ کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا مبسوط بیان ہوتا۔ اقبالؒ کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان۔ محفل علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا۔ وہ نخلستان جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے نخیلِ بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھے گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے۔ پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا۔ اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعۂ اقبالؒ میں مستغرق بحرِ قرآن کی غواصی کر رہا ہو تو کیا، اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو تو کیا۔ وہ ع

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

ہوتا ہے، دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر ہے۔ وقفۂ چائے میں لطافت و ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی، وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد "شمع" پھر شیخِ قلندران کے سامنے پہنچ جاتی، پرویز صاحب ہمیں ان گزرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گردِ راہ بن جاتے اور فلک زمین معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں "سفرِ اقبالؒ" زمین کے ہنگاموں

کو نہ بھولتے اور انہیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت انہیں کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیرِ اقبالؒ کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبالؒ کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان بھیڑی۔ انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انہیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انہیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر، قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اب اقبالؒ کو سمجھا ہے۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں، وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں۔ "سفیرِ اقبالؒ" کا لقب انہیں کو زیب دے سکتا ہے۔ اب تک وہ پیامِ مشرق، ضربِ کلیم، اور اسرار و رموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبالؒ کی سیرت، فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے، آپ نے ضربِ کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمہ میں مجلسِ قلندران کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔[ط]

اس مجلس میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز (حصہ اردو) جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد، بانگِ درا، (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا پورا احساس رہا کہ کوئی مختصر نویس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ سے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور اس طرح کہا یا سنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبالؒ پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جا سکتی۔ لیکن بقولِ غالبؔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سفیرِ اقبال نے دامن بھر بھر کے اس متاعِ فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ مجلسِ قلندران ——— ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آئندہ نشست میں ختم ہو جانا تھا تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر میں یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیرِ اقبال اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے امتیازات ختم کر دیئے جاتے۔ ہر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیلِ ہر حلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

ط اگرچہ یہ تعارف اور مقدمہ اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم ڈاکٹر عزامؒ کی یاد میں انہیں کسی دوسرے وقت پھر قارئین کے سامنے لائیں گے۔ (طلوعِ اسلام)

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کی شام کو منعقد ہوئی تھی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی فرزانے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیرِ اقبالؔ پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو "متشکل" کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندرانِ اقبالؔ، جو نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لئے پھرتے تھے، اس کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا۔ مگر چہرے سنجیدہ تھے۔ نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی ۔۔۔ کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی

نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا ۔۔۔ دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

اس لئے کہ ہر ایک کی حالت یہ تھی ؎

کشادم چشم و بربستم لب خویش

سخن اندر طریقِ ما گناہیست!

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیرِ اقبالؔ اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا، وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا۔ جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیامِ اقبالؒ اور تعلیم قرآن ہی کے صدقے میں تھا، ورنہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل ناآشنا ہو رہی تھیں۔

یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اتفاق سے اس دن "پس چہ باید کرد" کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا، جس کا عنوان ہے "درحضور رسالتمآبؐ"۔ ایک طرف اقبالؒ حضورِ رسالتمآبؐ ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؛ دوسری طرف شیخِ قلندران اور سفیرِ اقبالؔ۔ دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر والہانہ کیفیت طاری تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفل سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے[ط1] وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ اب جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے، وہ اسے اپنے لئے فردوسِ گوش بنا لیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیف بادۂ حیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حریم کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جواب قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے۔ اور جس سے آنے والے دن، ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔ (خورشید۔ ۱۹۵۵ء)

--- (٠) ---

تتمہ:- اس کے بعد سفیر صاحب (ہم انہیں ہمیشہ اسی لقب سے پکارا کرتے تھے) جدّہ تشریف لے گئے اور اپنے

ط1 یہ تصویر طلوعِ اسلام بابت ۲۳ اپریل ۱۹۵۵ء کے ٹائیٹل پر شائع ہوئی تھی۔ (طلوعِ اسلام)

ہر خط میں اس وعدہ کو دہراتے رہے کہ جونہی حالات مساعد ہوئے وہ تمام "قلندروں" کو دعوت دیں گے اور "ارمغانِ حجاز" کا مطالعہ اور ختم، حریمِ کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبوی (علیہ التحیۃ والسلام) میں ہوگا۔ (اس دوران میں حالات ناسازگار رہے جن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں، وہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (منعقدہ لاہور) میں تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کی پہلے سے اطلاع دے دی اور تاکید سے لکھا کہ تم کلوکیم میں ضرور آنا تاکہ ملاقات کے لئے کافی وقت مل جائے۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا اور جس گرمجوشی سے وہ ملے اس سے میرے سینے میں ابھی تک حرارت کا احساس باقی ہے۔ انہی کے ایما سے کلوکیم کے دوران، دیال سنگھ کالج ہال میں، "من و یزداں" کے عنوان پر میری تقریر ہوئی جس کی انہوں نے صدارت فرمائی۔ پھر یہیں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ کلوکیم کے بعد، کراچی پہنچ کر ایک شام، مختص کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مجلسِ قلندران کا انعقاد ہو جائے۔ ۹ جنوری ۱۹۵۸ء کی شام (سفارت خانے کی بجائے میرے کاشانہ میں) اس مجلس کا انعقاد ہوا اور زمانے کی طنابیں چار سال پیچھے کو کھینچ گئیں۔ نہ معلوم ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس مجلس کا ریکارڈ بھی ٹیپ پر محفوظ کر لینا۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ رخصت کے وقت انہوں نے تمام قلندروں سے با چشمِ نم کہا کہ اب حریمِ کعبہ میں ملاقات ہوگی۔

کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات حریمِ جنت پر ملتوی ہو جائیگی۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے حجاز میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس قیامت خیز المیہ پر پرویز صاحب نے حسب ذیل تعزیت نامہ خون کے آنسوؤں سے لکھا جو طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۵۹ء سے شائع ہوا۔

"جمعہ ۲۳ جنوری کی صبح اچانک اطلاع ملی کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے (الریاض میں) انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر اس قدر غیر متوقع اور یہ سانحہ ایسا ہوشربا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر عزام کی حرکتِ قلب بند نہیں ہوئی، علم و عشق کی محفلوں کے چراغ گل ہو گئے۔ اس حادثہ جانکاہ سے عالمِ اسلامی کو کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ دوسرے بھی کر سکتے ہیں لیکن اس سے میرے دل پر کیا گزری ہے اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ میری آنکھیں ہنوز علامہ اسلم جیراجپوری جیسے غمگسار رفیق اور مشفق بزرگ کی یاد میں شبنم افشانیوں سے آسودہ نہیں ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر عزام جیسے غمخوار دوست، اور جاں نواز ہمسفر کی جدائی وجہ اختر شماری بن گئی۔

مرحوم کو اقبال اور قرآن سے عشق تھا اور ان کا یہی عشق ہمارے رابطہ کی بنیاد بنا۔ ہم جوں جوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے قلب و نظر کی ہم آہنگی بڑھتی چلی گئی تاآنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی کہ ہمارے راستے بھی ایک ہیں اور منزل بھی ایک۔ اس رفاقت سے میرا سفر خیابان خیابان چمن ہو گیا — آج میں اس راہ گذر میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں —— بالکل تنہا۔

میں نے اپنے مرحوم دوست کو بہت قریب سے دیکھا۔ عربی ادب و لغت میں ان کی ژرف نگہی ایک الگ داستان ہے لیکن ایک انسان اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا جو مقام تھا مجھے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا قلب عبارت تھا قرآن کے عشق، اسلام کی محبت اور ملت کے لئے بے پایاں درد سے۔ نگاہ کی بلندی، ظرف کی وسعت، دل کی کشادگی، سیرت کی پاکیزگی، کردار کی پختگی، فکر کی رفعت، جذبات کی گہرائی۔ ذوق کی لطافت اور شوق کی وارفتگی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ پیکرِ اخلاص و محبت تھے "عشق و زیرکی" کا حسین امتزاج۔ وہ دین و دانش کا پاکیزہ عصارہ۔ وہ دنیائے علم و فضیلت کا امام۔ وہ جہانِ تپش و تلاش کا شعلۂ بیباک۔ وہ معارفِ زندگی میں شمشیرِ عریاں۔ وہ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں۔ ہم میں نہ رہا — اس کے جانے سے علم کی بستیاں اجڑ گئیں، عشق کی محفلیں سنسان ہو گئیں۔

سلام! اے "نور و نکہت کی داستانِ خموش" —— تجھ پہ ہزار و دل سلام!!

عمر با چرخ بگردد کہ جگر سوختہ
چوں تو از دودۂ آتش نفساں می خیزد

جگر فگار —— پرویز (فروری ۱۹۵۹ء)

رجم کی سزا

ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہمیں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنا چاہیئے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کے خلاف، وفاقی حکومتِ پاکستان نے، سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم پر پابندی عائد ہوتی ہے کہ نفسِ مسئلہ پر تفصیل سے کچھ نہ لکھا جائے۔ لہٰذا ہم سردست معذور ہیں۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام کی ستمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں ایک تفصیلی مقالہ شائع ہوا تھا۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے بعض اقتباسات آگے چل کر پیش کئے جائیں گے۔

۲۔ وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ

اس دوران میں، شرعی وفاقی عدالت کے صدر، محترم جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین احمدؒ کے فیصلہ کا متن روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۱۰ اور ۱۱ اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہم اس کا ملخص (بلا تبصرہ) درج ذیل کرتے ہیں:۔

(۱) جب کسی معاملہ کے متعلق قرآنِ کریم کی نصِ صریح موجود ہو، تو وہ قولِ فیصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد کسی بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۲) قرآنِ کریم کی کسی آیت میں نہ تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے، نہ اسے منسوخ قرار دیا جا سکتا۔ پورے کا پورا قرآنِ کریم غیر متبدل اور غیر منسوخ ہے۔

(۳) قرآنِ کریم کی کسی آیت کو حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس کی سند میں خود حضورؐ کی ایک حدیث موجود ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ

کلامی لا ینسخ کلام اللہ۔ وکلام اللہ ینسخ کلامی۔ کلام اللہ ینسخ بعضہ بعضا۔ (مسند امام احمد۔ وحجۃ اللہ البالغہ۔ شاہ ولی اللہؒ)

میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ (اس کے برعکس) کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ قرآن کو تو قرآن ہی منسوخ کر سکتا ہے۔

ط "کر سکتا ہے" کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا نہیں۔ جو قرآن ہمارے پاس ہے اس کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

(۴) قرآنِ کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے۔ اور یہی قولِ فیصل ہے۔ رجم کی سزا خلافِ قرآن ہے اس لئے اس قانون کو منسوخ کر دینا چاہیئے جس کی رو سے اسے حد (سزا) قرار دیا گیا ہے۔

فیصلہ کے آخر میں وہ کہتے ہیں:-

اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ ایک طرف، سورۂ نور کی آیت ۲ میں قرآنِ مجید کا صاف، واضح، غیر مبہم، دوٹوک حکم موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کوئی حدیث نہ قرآن میں تبدیلی ..... کر سکتی ہے، نہ منسوخ۔ اس کے برعکس رجم کی سزا کے حق میں کچھ احادیث ہیں جو مبہم، غیر متیقن اور باہمدگر متضاد ہیں، بلکہ بعض ایسی جن کا حدیث ہونا بھی مشکوک ہے۔ فقہا کے اقوال بھی غیر یقینی اور متضاد ہیں۔ اندریں حالات، نیز ان حقائق کے پیشِ نظر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں، اور اس باب میں قطعاً تامل محسوس نہیں کرتا کہ میں سورۂ نور کی آیت ۲ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوا قرآنی فیصلہ کی اطاعت کروں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ زانی کی سزا، خواہ وہ شادی شدہ ہو اور خواہ وہ غیر شادی شدہ ہو، پبلک کے سامنے کوڑے مارنا ہے۔

(۰)

۳۔ بعض روایات

اس سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ رجم کی سزا، خود خدا کی مقرر کردہ ہے۔ اس کی تائید میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

حضرت زر بن جیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعبؓ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۂ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا، یہی (۷۲-۷۳) جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ سورۂ احزاب میں، سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں (یعنی ۲۸۶ آیات) ان میں ایک آیۂ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کرتے تھے۔ میں نے پوچھا، آیۂ رجم کیا تھی؟ فرمایا۔ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے، یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

(الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ اردو ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری۔ ص۴۲)

اس روایت میں دو ایک نکات غور طلب ہیں:-

(۱) سورۂ احزاب میں (۲۸۶) آیات تھیں لیکن اس میں اب (۷۲ یا ۷۳) آیات ہیں! سوال یہ ہے کہ باقی آیات کہاں گئیں؟ اور کیا یہی ہے وہ قرآن جسے ہم تحدّی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی!

(۲) اس روایت کی رُو سے آیۂ رجم میں "الشیخ و الشیخۃ" کے الفاظ آئے تھے جن کا ترجمہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہے۔ لیکن یہ حضرات اس کا اطلاق شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت پر کرتے ہیں۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیۂ رجم گئی کہاں؟ سنن ابن ماجہ (جو صحاح ستہ کا ایک مستند مجموعۂ احادیث ہے) میں ہے کہ جب قرآن مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کبارؓ کو دو آیتیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت رجم کے متعلق تھی اور دوسری رضاعت سے متعلق۔ چنانچہ وہ انہیں ڈھونڈھنے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ

آیۂ رجم اور آیۂ رضاعت کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

اس طرح ان آیات ... کا دنیا میں وجود نہ رہا۔ صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ جب آپ اس آیت کی رسول اللہؐ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے تو اسے قرآن میں درج کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ نے جواب دیا:۔

وقال عمرؓ ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لاثبتہ فی المصحف۔

(تفسیر کبیر۔ امام رازیؒ۔ نیا ایڈیشن۔ جلد ۳۲۔ صفحہ ۱۳۲)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو ضرور قرآن میں درج کر دیتا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن میں اضافہ کر دیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو؟ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔

یوں رجم کی سزا حکمِ خداوندی کے مطابق قرار پا گئی۔

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابقِ فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے۔ اس موضوع پر بخاری کی ایک روایت ملاحظہ فرمائیے:۔

عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا قرود قد زنت فرجموھا فرجمت معھم۔

(صحیح بخاری۔ باب ایام الجاہلیۃ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانہ جاہلیت میں، میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا۔ اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجرؒ عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:-

حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری۔ تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر ادھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔ (فتح الباری شرح بخاری۔ جلد ہفتم۔ ص۱۲۱)

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی، جسے ان روایات کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

(۰)

فقہ حنفی نے ایسی شکل اختیار کی ہے جس کی رُو سے فعلِ زنا شرعاً جرم ہی قرار نہیں پاتا۔ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کے ناظمِ دینیات، مولانا محمد تقی امینی نے ایک عمدہ کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام ہے "احکامِ شرعیہ میں حالاتِ زمانہ کی رعایت"۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ فقہ میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان اس مضمون کا ہے کہ زنا کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جس میں اس فعل کا ارتکاب تو ثابت ہوتا ہے لیکن اس سے "حد" واجب نہیں ہوتی۔

مثلاً امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے کہ اگر کسی عورت کو زنا کے لئے کرایہ پر لیا اور اس سے منہ کالا کیا تو اس پر حد نہ لگے گی۔ (درر الاحکام شرح غرر الاحکام جلد ۲ ص۶۷) صاحبین کے نزدیک اس صورت میں (بشرطِ ثبوت) اگرچہ حد واجب ہو گی لیکن امام حنیفہ کی دلیل سیدنا حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ ہے:-

ایک عورت نے کسی مرد سے مال مانگا اور اُس نے کہا کہ اگر تو اپنے اوپر قابو دیدے تو مال دینے کے لئے تیار ہوں، اس صورت میں حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر حد ساقط کر دی کہ مال اس کا مہر ہے۔

اس کے بعد مولانا تقی امینی صاحب کہتے ہیں:-

مذکورہ تصریح کے مطابق، طوائفوں اور ان سے متعلق عادی مجرموں پر حدِ زنا واجب نہ ہو گی۔

(مذکورہ کتاب۔ ص۷۶)

حقائق و عبر

ذیل کا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

سوال:۔ میں چاہتا ہوں کہ فرقہ بندی کے توڑ میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں آیاتِ محکمات کو واضح طور پر علیحدہ اس طور سے ترتیب دی جائے کہ ان کا محکمات ہونا واضح کیا گیا ہو۔ اور پھر متشابہات کو بھی اسی طرح بالوضاحت علیحدہ بیان کیا جائے۔ طرزِ بیان اور اسلوبِ وضاحت ناصحانہ اور مصلحانہ ہو، نہ کہ مناظرانہ۔

جواب:۔ محترم بھائی! شاید آپ کا خیال ہے کہ قائدین تفرقہ نے کتاب و سنت کے احکام کو سامنے رکھ کر فرقے بنائے ہیں، اور اب اگر ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن و حدیث تفرقہ بازی کے خلاف ہیں تو وہ فوراً اتحاد و ائتلاف کے راستے پر پڑ جائیں۔ ایسا نہیں ہے اور نہ انہیں کوئی غلط فہمی ہے۔ فرقے بنائے بغیر ان کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ سب نے الگ الگ باڑے بنا لیے ہیں، ان میں اپنے اپنے ریوڑ محفوظ کر رکھے ہیں اور اپنے اپنے فرقے کے مخصوص کلامی علائم اور فقہی شعائر کی باڑیں تعصب کے بندھنوں سے باندھ رکھی ہیں۔ ہر گلہ بان اپنے ریوڑ کو برسوں اس بات کی تربیت دیتا ہے کہ وہ صرف اس کی بات سنے اور کسی دوسرے باڑے سے یا کھلے میدان سے اگر سو فیصد حق و صداقت کی آواز اٹھے تو بھی اسے نہ مانے کہ اس باڑے سے باہر کوئی شخص نہ صحیح العقیدہ ہے نہ صحیح العمل۔

ہر فرقے والا اپنے بزرگوں اور ہم مسلکوں کے افکار و اعمال کا گرویدہ رہتا ہے اور اس حلقے سے باہر کے اچھے سے اچھے مسلمانوں کے افکار و اعمال میں کھوٹ نکالتا ہے تاکہ کہیں اپنے ریوڑ میں خلل نہ پیدا ہو جائے۔

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو جو قرآن لائے وہ دعوتِ حق کے اس نمایاں نتیجے کو بیان کرتا ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ دین کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ مختلف قبیلوں اور نسلوں اور ملکوں کے لوگوں کو بھائی بھائی بناتا ہے۔ پھر قرآن ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان رشتۂ اخوت کا کئی بار ذکر کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ "بنیانِ مرصوص" بن کر رہیں اور نبی اکرمؐ اتحاد کو لازمۂ ایمان قرار دیتے ہیں۔ (لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا)۔

بلاشبہ تحریر و تقریر کے وسائل سے بھی امت کو دعوتِ وحدت دینی چاہیئے، مگر فرقہ وارانہ تعصبات کا مرض اتنا ہٹیلا ہے کہ اول تو فرقوں سے وابستہ افراد کسی بیرونی چیز کو پڑھیں گے ہی نہیں، اور جو اہم شخصیتیں پڑھیں گی وہ اس میں سے کچھ ٹیڑھ نکال کر اپنے لوگوں کو ڈرا دیں گی کہ ایمان میں خلل کا خطرہ ہے اور آخرت میں نقصان کا۔ بلکہ قائل کے منشا کے خلاف مفہوم کسی عبارت سے نکال لینا، کسی ادھوری بات کو سلسلۂ کلام سے منقطع کر کے اس سے ایک نتیجہ برآمد کرنا، حتیٰ کہ لفظی تحریف کر لینا بھی رائج و متداول ہے۔

آپ کا خیال ہوگا کہ ہم نے یہ اقتباس طلوعِ اسلام کے کسی سابقہ پرچہ سے نقل کر دیا ہے۔ جی نہیں! یہ نقل کیا گیا ہے جماعتِ اسلامی کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت فروری ۱۹۸۱ء (صفحہ ۳۹) سے۔ غنیمت ہے کہ انہوں نے "فرقے" کا لفظ تو استعمال کیا، ورنہ اب تو یہ حضرات فرقوں کو "مکاتبِ فکر" کہہ کر (اپنے آپ کو تو شاید نہیں، لیکن) سادہ لوح عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ:۔ ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (کھلے پارے)	روپے
پارہ نمبر ۱	۶/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۸	۴/- (فی پارہ)
پارہ نمبر ۲۹	۵/-
پارہ نمبر ۳۰	۶/-
مکمل سیٹ (کھلے پارے)	۱۲۵/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد تین جلدوں میں)	۱۵۰/- فی جلد ۵۰/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد چار جلدوں میں)	۱۵۰/- فی جلد ۴۰/-
تبویب القرآن (مکمل سیٹ)	۱۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۵۰/-
مطالب الفرقان (جلد دوم)	۵۰/-
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/-
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	۵۰/-
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۰/-
ابلیس و آدم	۳۵/-
جوئے نور	۳۰/-
شعلۂ مستور	۳۰/-

نام کتاب	قیمت
جہانِ فردا	۳۰/-
کتاب التقدیر	۳۵/-
معراجِ انسانیت	۵۰/-
اقبالؒ اور قرآن	۳۰/-
انسان نے کیا سوچا؟	۴۰/-
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۲/-
اسبابِ زوالِ اُمّت	۵/-
قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/-
ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (H.B)	۵۰/-
ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (P.B)	۴۰/-
سلسبیل	۱۵/-
فردوسِ گم گشتہ	۱۵/-
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/-
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم و سوم)	۱۵/- فی جلد
طاہرؒ کے نام خطوط	۱۰/-
مقامِ حدیث	۱۰/-

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
	روپے		روپے
اسلامی معاشرت	۶/-	قتل مرتد	۵/-
قرآنی فیصلے (مکمل ۴ جلدیں) (پہلی تین جلدیں، ہر جلد ۱۰/- روپے)	۴۵/-	تاریخ الامت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/- فی جلد ۵/-
جہاد	۵/-	تصنیفات (انگریزی) ڈاکٹر عبدالودود صاحب :-	
عربی خود سیکھئے	۱۰/-		
پاکستان کا معمارِ اوّل	۵/-	PHENOMENA OF NATURE & QURAN (H.B)	۵۰/-
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں - فی جلد ۸/-)	۱۵/-		
منزل بہ منزل	۱۵/-	CONSPIRACIES AGAINST QURAN (H.B)	۴۰/-
پرنسپل آف لا میکنگ ان اسلام (انگریزی)	۵/-	FOOD & HYGIENE IN ISLAM (P.B)	۸/-

کتابیں ملنے کے پتے:-

(۱)
ادارہ طلوع اسلام
۲۵/ بی - گلبرگ ۲ لاہور

یا

(۲)
مکتبۂ دین و دانش
چوک اردو بازار - لاہور

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

اندرونِ ملک (پاکستان) ---------- ۳۶/- روپے
غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ ---------- ۸۰/- روپے
غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ برائے :

۱- برطانیہ - فرانس - سوئٹزرلینڈ وغیرہ - ۱۳۰/- روپے
۲- دوبئی - بحرین - کویت - سعودی عرب وغیرہ - ۱۱۰/- "
۳- لیبیا - کینیا - یوگنڈا - جنوبی افریقہ -- ۱۲۵/- "
۴- امریکہ - کینیڈا وغیرہ ---- ۱۹۰/- روپے
۵- نیوزی لینڈ و آسٹریلیا --- ۱۷۵/- "
۶- انڈیا وغیرہ -------- ۱۱۵/- "

(طلوع اسلام کے متعلق صرف ادارہ طلوع اسلام کو لکھئے) (ناظم ادارہ)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جیسے مقامی بزمہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :-
		نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران کی مشہور کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں
لاہور	جمعہ ۸½ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱½ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT) M3N-2P5. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام کمرہ ۲۴ پارٹن چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIR MAINGATE) پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ۔ فون ۷۲۶۵۹ مکان شیر افضل خان صاحب۔ تہکال بالا۔ جمرود روڈ (پشاور)
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکا خیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل اکیڈمی پاس درکس۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۹۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
چکوال	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، محلہ ہجویری مسجد۔ نزد تحصیل آفس، باہتمام محمد صفدر ملک صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم ملحق۔ رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
گجرات	(۱) ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (۲) ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ --- باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ۔
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)
پنجگی تحصیل کبیر والا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۲½ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/ پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۲۸۵۵)

تحریکِ پاکستان کی کہانی

(طلوعِ اسلام کی زبانی)

اس داستان کی قسط اوّل، طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔
اب اس کی اگلی قسط پیشِ خدمت ہے۔

(۲)

مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا۔ دو سال کے عرصہ میں ملّتِ اسلامیہ کے اس اہم "مقدمہ" کے وکیل نے اس کے اصول و مبادیات کی تشریح و توضیح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ "مسلمان ایک مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں" ــــ "مسلم لیگ اس قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے"۔ یہ تھے وہ بنیادی اُصول جو اس دو سال کے عرصہ میں بدلائل منیرہ و براہینِ قاطعہ دنیا کی عدالت میں بارہا پیش کئے گئے۔ اب وقت آ چکا تھا کہ اس قوم کے اصل دعوے کو واضح الفاظ میں سامنے لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۴۰ء میں، لاہور مسلم لیگ کا وہ معرکہ آرا اجلاس منعقد ہوا جس نے نہ صرف ملّتِ اسلامیہ کی تقدیر بدل دی بلکہ دُنیا کے نقشے میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اس تقریب پر، ملّتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاسنامہ تھا۔ ہم اس سپاسنامہ کو بصد فخر و مسرت اس مقام پر دہراتے ہیں۔

"بہ شرفِ نظر!

شیرِ بیشۂ بیباکی و حریّت، ضیغمِ نیستانِ جرأت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست، پروانۂ شمعِ اخوت و حمیت، طرۂ کلاہِ ملک و ملّت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں و قائدِ اعظمِ اسلامیاں، عظمت مآب۔

محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلّہ العالی۔

حریّت نواز!

ذرا تصوّر میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیاباں میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ، بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا سر پر منڈلانے والی

شبِ تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو، درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں، دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں، وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلے کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں کہ دورِ افق کے اس پار سے ایک شاہسوار رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانیوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادیوں کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے، اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ سادہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی یہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رَو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں، ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گؤسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو!
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہ نمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملّت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں، ۲۱ ر اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا اور آپ کی نگہِ دوربیں نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگِ زمیں میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پَر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسولؐ کافۃ للناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گِل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولّی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنّیٔ آتش نفس سرودگاہِ وارد ھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں"؎۔ اس لئے اسلام کو کسی دوسرے

؎ ابوالکلام آزاد۔

مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب شاہین بچوں کے لئے احساس کی بازوشکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے "شریفانہ معاہدے" (GENTLEMAN'S AGREEMENT) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر ہو۔ انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملّتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی استعداد بھی نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ کیسے مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم میں اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشاں میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ جانگداز اور مہیب مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دھا (RADIO STATION) کے آلۂ تکبیر الصوت (LOUD SPEAKERS) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا ساتھ ہی کلیسا میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دل خراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے ؎

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک　　مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حافظ ڈاکٹر ذاکر حسین خان۔

حضرتِ مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے۔ کہ مسلمانوں کی موجودہ تنگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر اس مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیتِ مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کی تشکیل کے سوا کچھ اور نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطحی بین لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبداءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہنِ رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پرسوز و پُر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے ؎

خرد نے تجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاعِ گراں بہا ہے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز جاں پُرسوز!
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے، اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور ان کی خاطر آپ نے جو گراں قدر قربانیاں دی ہیں ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے (CONSTITUTIONALLY) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہو گی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ، اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے کہ یہ طوفانِ بلا انگیز کسی کے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہو گا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ۔

سیدِ القوم!

ادارہ طلوعِ اسلام، جسے ہزارہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھائے جایئے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سربکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے ؎

"با نشۂ درویشی در سازو دمادم زن چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن"

یہ سپاسنامہ اس قائد کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ملتِ اسلامیہ کی راہ نمائی اس کی متعینہ منزل کی طرف کر رہا تھا لیکن بعید از سپاس گذاری ہوتا اگر اس موقع پر ملتِ اسلامیہ کے اس محسنِ اعظمؒ کی یاد تازہ نہ کرائی جاتی، جس نے ملت کے لئے خود اس منزل کو متعین کیا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ذیل کی سطور بھی اسی پرچہ میں باعثِ ہزار فخر و مباہات شائع ہوئیں۔

"صبحِ امید"[1]

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں!
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبالؒ)

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے، مسلمانوں نے ایک مدت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ کے جمود و تعطّل کی برف کی سلیں حوادثِ زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک دہشت زار بیابان میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد کے دل میں اپنی متاعِ گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساسِ زیاں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زندہ و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا نہ نشانِ راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف کشتیٔ ملت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جداگانہ انتخاب اور تخصیصِ نشست و نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ رہے تھے۔ ان کے مطالبات مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گھر کر رہ چکے تھے۔ اور ان کی نگاہیں جمہوری نظامِ حکومت کی بظاہر درخشندہ اُفق پر جا کر رک چکی تھیں۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے جنہیں فطرت نے صرف "دانشِ برہانی" عطا فرمائی تھی۔ اور وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے امیال و عواطف اور حوادث و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہنچ سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن اس شمشیرستانِ انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک ایسا بندہ بھی موجود تھا جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر تدبّر و تفکر سے ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں اور ان مشاہدات سے اس کے آئینۂ ادراک میں "آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر" نظر آ جاتی ہے۔ اس کی نگاہِ دوربین "آشیانہ"[2] کی نظر فریب پائیداری کے بجائے اس شاخ کی نزاکت پر ہوتی ہے جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آئندہ الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے اور وہ ان ہی حقائق کی دوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے

۱؎ علامہ اقبالؒ۔

۲؎ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، نا استوار ہوگا (اقبالؒ)

چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے۔

ہاں تو اس ہنگامہ زار انتشار و خلفشار میں یہ مردِ مومن، جسے قسامِ ازل نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا، اُٹھا، قافلہ کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا۔ اور کہا کہ آؤ! تمہیں منزل بتاؤں کہ قرآنِ کریم نے تمہاری منزل کونسی متعین کر رکھی ہے۔ اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی صراطِ مستقیم ہے۔ اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ

"اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے، برعکس یورپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا بّرِ اعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان، مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کوئی مشترک فسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔ میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کی حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقے میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اور یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا..... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقاء کا موقع ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قوی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلّط ہو....."

(خطبۂ صدارت حضرت علّامہ اقبالؒ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اس لئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ معمول ہی چکا تھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان و عملِ صالح کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور مسلمان دُنیا میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومتِ خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہو گی، اسی لئے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالمِ تصور کے حسین خواب

ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ زادِ دماغ کی اپج ہے جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک قرار دیتا ہے۔ جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل بالذات جداگانہ قوم گردانتا ہے۔ جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لئے ناقابلِ عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا، حالات بدلتے گئے اور ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاستِ ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں جو ۱۹۳۰ء میں اس "دیدۂ بینائے قوم" نے پیش کیا تھا (رحمۃ اللہ تعالیٰ) آج یہ مسائل ایک ایک کر کے واضح اور بیّن طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک ہے۔ مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کا تصفیہ فرقہ دارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ بنا بریں مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت یہاں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان امراض کا واحد علاج تقسیمِ ملک ہے۔ آج اس کے لئے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ مختلف سکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں، ہر شخص اسی نہج پر سوچتا اور اسی طریقِ عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا، وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔ مثلاً مسٹر این سی۔ دت (سابق رکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:-

> ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک۔ متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ (مدینہ۔ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادثِ زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان، ضعفِ عزیمت و شدّتِ انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا جو ان چٹانوں کو ریت کے ذرّوں میں تبدیل کر دے، جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں۔ لیکن جب اس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے اور اس کے دل میں اپنے

نصب العین تک پہنچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے تو ان عارضی حوادث و موانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چند دنوں کے بعد دنیا دیکھ لے گی کہ بتوفیقِ ایزدی (اسی مردِ راہ ہیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں) ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدۂ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود!
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

(اقبالؒ)

(۰)

رام گڑھ

مارچ ۱۹۴۰ء میں اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کرسیٔ صدارت سے راشٹرپتی ابوالکلام آزاد صاحب اعلان فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کا دعویٰ آزادی غلط ہے۔ انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر جینا ہوگا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ یہی قرآن کا ارشاد ہے۔ ادھر یہ دونوں اجتماعات لاہور اور رام گڑھ میں انعقاد پذیر تھے اور اُدھر جبریل اور ابلیس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہو رہے تھے۔ زمین اس بدبختی پر روتی تھی اور تقدیر اس پر ہنستی تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں جناب آزاد کے خطبۂ صدارت پر ایک جامع تبصرہ شائع ہوا جس میں انہیں بتایا گیا کہ ان کا آج کا "قرآن" ان کے تیس برس پیشتر کے "قرآن" سے کس قدر مختلف تھا!

(۰)

جہانِ نو

جب ملتِ اسلامیہ کے اجتماعِ لاہور نے اپنے مطالبہ کو متعین طور پر واضح کر کے اس کا اعلان کر دیا تو ضرورت تھی کہ اس مطالبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس کے ماعلیہ و مالہٗ پر بالوضاحت تنقید و تبصرہ سے اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا جائے کہ یہ مطالبہ کیا ہے؟ کس لئے کیا گیا ہے؟ اور اس کے حصول کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے لئے جون ۱۹۴۰ء کے رسالہ میں اسی صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون بہ عنوان "جہانِ نو" شائع ہوا جس نے فی الواقعہ دنیا کو ایک "جہانِ نو" سے متعارف کرایا۔ اس سے پیشتر بہت کم لوگ تھے جنہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمان اس مطالبہ پر کیوں مجبور ہے۔ اس سے حقیقی مقصود کیا ہے۔ اور یہ کہ اس "جہانِ نو" کے قیام سے کس طرح اس دنیائے کہن کا جہنم، تسکین و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔

(جاری ہے)

(۰)